جلد ۹۸ نومبر ۱۹۸۲ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	نومبر ۱۹۸۲ء مطابق محرم ۱۴۰۳ھ	جلد ۹۸

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ- لاہور

فون نمبر ——— ۳۱۶-۴۱

زر سالانہ تیس روپے- فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اخبارات میں اس واقعہ کا چرچا ہے کہ پولیس کے ایک سابق ملازم کو کسی بزرگ کے وعظ و تلقین سے یہ احساس بہ شدت لاحق ہوا کہ حرام کمائی پر زندگی بسر کرنے والے کے لیے قیامت کے دن کوئی راہ نجات نہیں ہے۔ اور وہاں کی طویل سزا سے بے اماں سے نمازیں اور روزے بھی نہیں بچا سکتے۔ چنانچہ مالِ حرام کے اس وبال کا شعور ہوتے ہی اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا کہ اس کی قائم کردہ مثال موجودہ تاریکی میں ایک مشعل بن گئی ہے۔ اس کے پاس تھوڑی سی اراضی تھی وہ اس نے بیچی اور اس کی قیمت ان افراد میں تقسیم کرنا شروع کی جن سے اس نے رشوت لی تھی۔ وہ جگہ جگہ کا سفر کر رہا ہے اور اپنے زخم رسیدگان کو تلاش کر کر کے ان تک اپنے سچے جذبۂ تلافی کا مرہم پہنچا رہا ہے۔ اور ان سے معافی بھی مانگ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے بہت سے مظلوم افراد یاد ہی نہ آتے ہوں۔ بہت سے فوت ہو چکے ہوں یا نقل مکانی کر گئے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی پونجی سارا حساب بے باق کرنے کے لیے کافی نہ ہو۔ مگر اس نے سچی توبہ کا ایک نمونہ پیش کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ باقی رہ جانے والے ستم رسیدگان جب قیامت کے دن اس کے احوال سے آگاہ ہوں تو اسے معاف کر دیں۔

اصل مصیبت یہ ہے کہ آج میخانۂ دولت پرستی کے جام چڑھا چڑھا کر لوگ اس طرح بدمست ہیں کہ کسی کو مالِ حرام کے وبال کا احساس ہی نہیں رہا۔

اپنی عمر کی ابتدا میں ایسے گھر ہم نے دیکھے جن کے مکینوں نے ہمیشہ احتیاط کی کہ کوئی حرام شے گھر میں داخل نہ ہو۔ ایسے باپ ہم نے دیکھے جنہوں نے کسی ناجائز آمدنی کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میرے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ایسی مائیں ہم نے دیکھیں جنہوں نے کبھی یہ گوارا نہ کیا کہ اُن کے شیر خوار بچوں کے منہ میں دودھ کا کوئی ایسا قطرہ چلا جائے جس میں حرام کی آمیزش ہو۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہماری آبادیوں میں ایسے لوگ بکثرت موجود رہے ہیں جو شرافت کی قدروں سے محبت کرتے تھے اور جن کے ضمیر زندہ تھے۔ بخلاف اس کے آج رزقِ حرام کی پروردہ نسلوں میں جوہرِ شرافت ختم ہو رہا ہے۔ اور ایمان کی حرارت، ضمیر کی حساسیت، اسلامی اخوت اور جذبۂ خدمتِ انسانیت کے سرمائے ختم ہو رہے ہیں۔[1]

رزقِ حرام کے جو اثراتِ بد ہر کسی کو چشمِ سر سے دکھائی دے سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ دولت کی ہوس بڑھتی جاتی ہے، مصارف کا بہاؤ ہر بند توڑتا جاتا ہے، تفریحات و تعیشات کا رجحان بڑھتا ہے، جرائم میں افزودگی ہوتی ہے۔ تشدد کے خنجر کی کاٹ بڑھتی جاتی ہے۔ فحاشی و آوارگی زور پکڑتی ہے۔ اور ایک عام ذہنی انتشار و اضطراب قلوب کو گھیر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہے، اور اگر کوئی روک تھام نہ ہو سکی تو تباہی کا یہ طوفان پورے زور سے اُمڈے گا۔ یہ طوفان اُمڈ پڑا تو ہر قیمتی چیز کو بہا لے جائے گا۔

فکر کرنی چاہیے کہ اس خطرے کی روک تھام ہو۔

رزقِ حرام کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حقائق ہمارے سامنے رکھے

---

[1] بعض جگہ اب بھی یہ اثرات باقی ہیں۔ قریب کا ایک واقعہ ہے کہ میرے ایک محب مکان بنانے کے لیے بنک سے سود پہ قرض کی رقم لے کر گھر پہنچے۔ اپنی بیگم کو جب انہوں نے اپنا کارنامہ بتایا تو عین دوپہر کے وقت اس نے اُن کو واپس کیا کہ اس سودی رقم کو ابھی واپس کر کے آئیں۔ اور انہوں نے رقم واپس کر دی۔ مکان کے لیے کوئی دوسرا انتظام ہو گیا۔

ہیں، ایمان والوں کو لرزا دینے والے ہیں۔ لبطور تلخیص چند اشارات درج ہیں۔

— جو گوشت (یعنی جسم) حرام سے پرورش یافتہ ہو، اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

— جس کسی نے کسی جھوٹے مقدمے (یا کسی اور باطل طریق سے) دوسرے کا مال حاصل کیا اُس نے اپنے لیے آگ کا ٹکڑا حاصل کیا۔

— جس شخص کا لباس اور کھانا پینا حرام ہو، اس کی نمازیں اور دُعائیں اور زبانی قبول نہیں ہوتیں۔

— رشوت کھانے والا ہو یا کھلانے والا دونوں کا ٹھکانا آگ ہے۔

— ایک شہید کے مال میں اگر کوئی معمولی سی چیز بھی ایسی ہو جو مالِ غنیمت میں سے امیر لشکر کے اذن کے بغیر کسی شخص نے اپنے آپ حاصل کر لی ہو تو صرف اتنے سے ناجائز مال کے بدلے میں حضورؐ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا کہ وہ دوزخ میں جلے گا۔[1]

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد کی چند روایات ملاحظہ ہوں:

حضورؐ اکرم کے مِدعَم نامی غلام کو وادیٔ القریٰ میں دشمن کا تیر لگا اور شہید ہو گیا۔ صحابہؓ نے اس موقع پر اس کی شہادت پر تحسین کی تو حضورؐ نے فرمایا "بخدا ایسا نہیں ہے۔ وہ جنت میں نہیں بلکہ غنائم کے اموال میں سے ایک چادر جو اس نے تقسیم سے پہلے (ہاں ہاں) حاصل کر لی تھی، وہ اس پہ آگ بن کر بھڑک رہی ہے"۔

ایک موقع پر اس اعلانِ عام کے باوجود کہ غنائم کے تمام اموال جمع کرا دیے جائیں۔ ایک صحابی نے بالوں کی بنی ہوئی ایک لگام کو جمع کرانے میں دیر کی۔ پھر وہ جب لے کر آیا تو حضورؐ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ تو اسے لیے قیامت کے دن حاضر ہوگا

خیبر کے غزوہ میں ایک صاحب وفات پا گئے۔ حضورؐ کو اطلاع دی گئی تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم جا کر اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ آپؐ نے جنازہ نہیں پڑھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے راہ خدا میں خیانت کی تھی۔ چند پتھر کے نگینے تھے جن کی مالیت دو درہم بنتی تھی۔ وہ اس نے چرا لیے تھے۔

— زکوٰۃ کے تحصیلداروں اور محکمہ کے کارکنوں کے متعلق آپ نے واضح طور پر خطبۂ عام میں فرمایا کہ تم میں سے اگر کوئی شخص قیامت کے دن اس حال میں ہوگا کہ رشوت کے مال کی کوئی بکری اس کے کندھوں پر لدی ہوگی، یا کوئی اونٹ اس پر سوار ہوگا، یا کپڑے کے تھان سر پر رہے ہوں گے اور وہ میرے پاس آکر کہے گا کہ یا رسول اللہ! مجھے اس مصیبت سے چھڑائیے تو ایسے لوگوں کو میں بتائے دیتا ہوں کہ میں نہیں چھڑا سکوں گا۔

— حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عزیز رفقا میں سے ایسے حضرات کے جنازے پڑھانے سے انکار کر دیتے تھے جن پر قرض کی صورت میں دوسروں کا کوئی حق باقی ہو اور اس کے فوری طور پر ادا کر دینے یا کسی دوسرے شخص کے ضامن و ذمہ دار بن جانے کا انتظام نہ ہو سکے۔

ان اشارات کی مدد سے ایک صاحبِ ایمان آدمی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ مالِ حرام شریعتِ محمدیہ کی رُو سے آدمی کے کردار اور اس کی عاقبت کے لیے کس درجہ خطرناک ہے۔

امت کی بدقسمتی ہے کہ اس کے علما اور واعظ معاملات کی طرف تو آتے ہی نہیں، نہ کبھی کسی دینی جلسے میں مالِ حرام کو موضوع بنایا گیا یا اس کے برعکس رزقِ حلال کی اہمیت واضح کی گئی۔

ہمارے واعظانِ شیریں مقام لہک لہک کر اور سُر لگا لگا کر جن چیزوں کو بیان کرتے ہیں وہ اُن کی فرقہ وارانہ پسند کے عقیدوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ دوسرا بڑا موضوع یہ ہوتا ہے کہ شانِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) بیان کرتے ہوئے حضور کی محبت کا ایسا تصور دلایا جائے کہ بس چند اذکار و وظائف ہیں اور کچھ درود و سلام کا سلسلہ ہے، جس نے یہ کر لیا اس کے لیے شفاعتِ حضورؐ واجب اور جنت لازم ہوگئی۔

واشگاف الفاظ میں میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کلمہ طیبہ (افضل الذکر) کا ورد کریں یا کلمتان خفیفتان علی اللسان وثقیلتان فی المیزان کا (سبحٰن اللہ وبحمدہٖ، سبحٰن اللہ العظیم)، خواہ آپ آیت کریمہ کی تسبیحیں پڑھیں یا آیت الکرسی کا وظیفہ کریں، حتیٰ کہ آپ بکثرت

نفل نمازیں پڑھیں یا نفل روزے رکھیں، ان ساری چیزوں کی برکات اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہیں جب کہ آپ کی مجموعی زندگی دینی لحاظ سے صحت مندانہ ہو۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک تندرست شخص اگر عام غذا کے ساتھ تھوڑی سی مقدار میں ایک آدھ انڈا یا چار چھ بادام یا تھوڑا سا مربہ یا دودھ وغیرہ کوئی چیز استعمال کرے تو اس کی توانائی بہت بڑھے گی۔ لیکن اگر آپ معدے کے مریض کو سوہن حلوا کھلائیں۔ یرقان زدہ آدمی کو خوب انڈے ٹھونسوائیں، یا پیچش کے مریض کو کشتۂ فولاد دینے لگیں تو وہ سفرِ حیات کو زیادہ تیزی سے طے کرے گا۔

ذکر اذکار اور درود وسلام تو اس وقت کارگر ہوتے ہیں جب توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان درست ہو، فرائض کا اہتمام اور منہیات سے اجتناب ہو رہا ہو اور خدا کے حقوق کے علاوہ خاص طور پر بندوں کے حقوق ادا ہو رہے ہوں تو ہر ذکر، ہر دعا، ہر خدمت، ہر انفاق کی بڑی جزا ہے۔ ایک ملازم ایک طرف سے فرم میں خیانت کر رہا ہو اور دوسری طرف ڈائریکٹر کے سامنے قصیدوں اور سلامیوں کا ڈراما کر کے یہ چاہے کہ اسے تنخواہ کے علاوہ بونس اور انعام اور ترقی دی جائے، تو یہ بڑا غلط انداز فکر ہے۔ وہ تو فی الحقیقت غبن کرنے کے بعد ملازمت اور تنخواہ کا بھی مستحق نہیں ہے۔ اُلٹا اس کی جگہ جیل میں ہے۔ اسی طرح دین میں بھی شرط اوّل یہ ہے کہ دیانت داری سے فرائض پورے کیجیے، حقوق ادا کیجیے، لازمی ڈیوٹیاں انجام دیجیے اور پھر کچھ زائد خدمات کر کے خصوصی انعام کا شوق رکھیے۔ نہ یہ کہ فرائض سے کوئی مطلب نہیں، خدا کے احکام وحدود کی کوئی پروا نہیں، رسول اللہ کی سنت اور آپ کی تاکیدوں اور تنبیہوں کا پاس نہیں، حرام وحلال کا کوئی خیال نہیں ــــ اور چلے ہیں چند فرقہ وارانہ عقیدوں اور خاص خاص اذکار کے بل پر حضورؐ کی شفاعت اور خدا کی جنت حاصل کرنے کے لیے!

فرائض اور ضروریاتِ دین کے بارے میں لاپروائی، معاملات واخلاق کے اچھا یا بُرا ہونے کے متعلق دلوں کی غفلت اور حلال وحرام کے احساس سے بیگانگی اور غلبہ دین اور اقامت نظامِ حق کی جدوجہد سے لاتعلقی جو چاروں طرف پائی جاتی ہے اس میں بہت بڑا حصہ

ہے اُن واعظین کا جو محراب و منبر پر قابض ہیں اور لوگوں کو اچھی اچھی میٹھی گولیاں کھلا کر دین کے مخصوص عملی تقاضوں سے غافل کرنے کی خدمت نسلاً بعد نسلٍ انجام دے رہے ہیں۔

عوام میں یہ احساس رچ بس گیا ہے کہ زندگی میں جو چاہیں کرتے رہیں، بس کسی موقع پر ایک ختمِ قرآن کا انتظام، کسی عرس میں شرکت، کسی بزرگ کی قبر پر حاضری، کچھ دعائیں، کچھ اذکار، کبھی درُود کی تسبیح خوانی اور کبھی سلام کے لیے کھڑے ہو کر زور زور سے یارسول اللہ پکارنا یا لوگوں کا کلمہ سیدھا کرا دینا تمام گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہیں۔ یہ مذہبی تصوّر ایک ایسا چُورن ہے کہ جس کے اثر سے حلال حرام سب یکساں طور پر ہضم ہو جاتا ہے اور جزوِ بدن بن جاتا ہے۔ بلکہ سرے سے حلال حرام کی تمیز اور فکر ہی ختم ہو جاتی ہے۔

ہمارے ہاں کے قاتل، چور، جواری، مغوی، زناکار، خائن، راشی اور غنڈہ عناصر سب کے سب اس چورن کو استعمال کرتے ہیں۔

مجھے عرصہ دراز ہوتا ہے کہ میں بارہا مذہبی جلسوں میں شریک ہوتا رہا ہوں، نہایت ہی محترم دینی بزرگوں کی بہت سی تقریریں سُنی ہیں۔ لیکن شاذونادر ہی کبھی کوئی ایسی گفتگو سُنی کہ انسانوں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے کون سے رویے ہیں جو ایمان کو نقصان پہنچانے اور آخرت کے لیے خطرے کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح میرے سامنے کم ہی کسی نے اس موضوع پر کلام کیا کہ رزقِ حلال کی اہمیت شرعاً کیا ہے اور رزقِ حرام میں کیا وبال ہے۔

اگر ایک بار یہ تبدیلی آسکے کہ ہمارے مختلف فرقوں کے بزرگ یہ فیصلہ کر لیں کہ اخلاق و معاملات اور حلال و حرام کے متعلق عوام کے شعور کی آبیاری کرنی ہے تو بڑی تبدیلی آسکتی ہے۔

علما کی جماعتیں بھی ہیں۔ اُن کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ اُن کے اندر آنے کی ایک شرط لازم یہ ہے کہ آدمی حرام سے اجتناب کی کوشش کرنے والا ہو۔ اسی طرح بے شمار پیرخانے ہیں اگر مشائخ یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ کسی ایسے مرید کو اپنے حلقۂ بیعت میں شامل نہیں کریں گے،

جو کسب حلال کی پابندی قبول نہ کرے اور اگر کوئی حرام ذریعہ آمدنی (یا جائیداد) اس کے پاس ہو تو اسے ترک نہ کر دے۔

میں تو یہ کہوں گا کہ ایک اسلامی معاشرے کے اندر جو سیاسی جماعتیں بنتی ہیں، وہ خواہ سیاسی لحاظ سے اپنے آپ کو سیکولر رکھنے پر اصرار کرتی ہوں، اپنے دستور میں ایک لازمی دفعہ یہ رکھیں کہ حرام آمدنی یا اموال رکھنے والا شخص ہمارے دائرے میں داخل نہیں ہو سکتا تو پھر رزقِ حرام کی یہ گرم بازاری باقی نہیں رہ سکتی۔

مشکل تو یہی ہے کہ حرام آمدنیاں رکھنے والوں کو (خواہ وہ سود کی ہوں یا اسمگلنگ کی یا رشوت کی) ہر جگہ خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ سیاسی جماعتیں تو ذرا بعد میں آتی ہیں، مذہبی جماعتوں کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی مال دار آدمی ساتھ آجائے، خواہ اس کی آمدنی کیسی ہی ہو تو ان کے ہاں بہار آجاتی ہے۔ انہیں، گر بڑی سے بڑی کمائی والا آدمی اچھا چندہ دے دے تو اسے اپنی مجالس و تقاریب کا صدر تک بنانے میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔

حرام خوری کے خلاف ہمارے معاشرے میں ایک زوردار مہم چلنی چاہیے جس میں سربراہی تو مذہبی بزرگ اور مشائخ کریں مگر ان کے پیچھے سیاسی لوگوں کے علاوہ ادیب اور صحافی اور ریڈیو ٹیلی وژن کے کارکن سبھی محاذ آرا ہوں۔

مالِ حرام کی وبائے عام کو بڑھانے میں جدت مآب ترقی پسند خواتین کا بھی حصہ ہے۔ یہ لوگ ایک طرف تو ٹھاٹھ باٹھ کا گھر چاہتی ہیں، اونچے معیارِ زندگی کی طرف اڑان کرتی ہیں، دوسرے اپنے فیشن اور زیب و زینت پر خرچ کرنے میں ہم سطح خواتین کا مقابلہ کرتی ہیں۔ پھر کھیل تماشوں، سیر سپاٹے اور طرح طرح کی سوشل مجلسوں اور ثقافتی تقریبوں اور مینا بازاروں میں حصہ لیتی ہیں۔ اپنے گھروں پر اپنی اور ایک ایک بچے کی سالگرہ اور ان کے امتحانات میں کامیابیوں کی تقریبیں خوب نمود و نمائش سے مناتی ہیں۔ یہ سارے سلسلے معاشرتی مرتبے (STATUS) کے بت کی پرستش کی حیثیت اختیار (باقی بر صفحہ ۵۶)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

سورۂ عصر کے معارف

جب قرآن پورے زور اور قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ "درحقیقت انسان بڑے خسارے میں ہے۔" تو اس کا مطلب دُنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے، اور جب وہ کہتا ہے کہ اس خسارے سے صرف وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر حسبِ ذیل چار صفات پائی جاتی ہیں تو اس کا مطلب دونوں جہانوں میں خسارے سے بچنا اور فلاح پانا ہے۔

اب ہمیں اُن چاروں صفات کو دیکھنا چاہیے جن کے پائے جانے پر اس سورۃ کی رُو سے انسان کا خسارے سے محفوظ رہنا موقوف ہے۔

اِن میں پہلی صفت ایمان ہے۔ یہ لفظ اگرچہ بعض مقامات پر قرآن مجید میں محض زبانی اقرارِ ایمان کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ (مثلاً النساءؔ آیت ۱۳۷، المائدہؔ آیت ۵۴، الانفالؔ آیت ۲۰، ۲۷، التوبہؔ آیت ۳۸، اور الصّفؔ آیت ۲ میں) لیکن اس کا اصل استعمال سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے معنی ہی میں کیا گیا ہے اور عربی زبان میں بھی اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔ لغت میں اٰمَنَ لَهٗ کے معنی ہیں صَدَّقَهٗ وَاعْتَمَدَ عَلَيْهِ (اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا) اور اٰمَنَ بِهٖ کے معنی ہیں اَيْقَنَ بِهٖ (اس پر یقین کیا) قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے، اس کو ان آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا (الحجرات - ۱۵)	مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (حٰمٓ السجدۃ۔ ۳۰)

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ڈٹ گئے۔

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُھُمۡ (الانفال ۲)

مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل لرز جاتے ہیں۔

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ (البقرہ ۱۶۵)

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ کی محبت رکھتے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَھُمۡ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِھِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَیُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا (النسآء ۶۵)

پس نہیں، (اے نبیؐ) تمہارے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اُس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔

اِن سے بھی زیادہ اِس آیت میں زبانی اقرارِ ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ۔ (النسآء ۱۳۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

اب رہا یہ سوال کہ ایمان لانے سے کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے، تو قرآن مجید میں پوری طرح اس بات کو بھی کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اِس سے مراد اوّلاً اللہ کو ماننا ہے۔ محض اس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اُسے اِس حیثیت سے ماننا ہے کہ وہی ایک خدا ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اس کا مستحق ہے کہ انسان اس کی عبادت، بندگی اور اطاعت بجا لائے۔ وہی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا ہے۔ بندے کو اسی سے دُعا مانگنی چاہیے اور اُسی پر توکّل کرنا چاہیے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے والا ہے۔ بندے کا فرض ہے کہ اُس کے حکم کی اطاعت کرے اور جس چیز سے اُس نے منع کیا ہے اُس سے رُک جائے۔ وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا

ہے۔ اُس سے انسان کا کوئی فعل تو درکنار، وہ مقصد اور نیّت بھی مخفی نہیں ہے جس کے ساتھ اُس نے کوئی فعل کیا ہے۔ ثانیاً رسولؐ کو ماننا، اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا ہادی و رہنما ہے، اور جس چیز کی تعلیم بھی اس نے دی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، برحق ہے، اور واجب التسلیم ہے۔ اِسی ایمان بالرسالت میں ملائکہ، انبیاء اور کتبِ الٰہیہ پر، اور خود قرآن پر بھی ایمان لانا شامل ہے، کیونکہ یہ اُن تعلیمات میں سے ہے جو اللہ کے رسولؐ نے دی ہیں۔ ثالثاً آخرت کو ماننا، اِس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی پہلی اور آخری زندگی نہیں ہے، بلکہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ ہوکر اُٹھنا ہے۔ اپنے اُن اعمال کا جو اُس نے دُنیا کی اِس زندگی میں کیے ہیں خدا کو حساب دینا ہے، اور اس محاسبے میں جو لوگ نیک قرار پائیں اُنھیں جزا، اور جو بد قرار پائیں اُن کو سزا ملنی ہے۔ یہ ایمان اخلاق اور سیرت و کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا ہے، جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ ورنہ جہاں سرے سے یہ ایمان ہی موجود نہ ہو وہاں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو، اس کا حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے جو موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

ایمان کے بعد دوسری صفت جو انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے ضروری ہے وہ صالحات (نیک کاموں) پر عمل کرنا ہے۔ صالحات کا لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے جس سے نیکی اور بھلائی کی کوئی قسم چھوٹی نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن کی رُو سے کوئی عمل بھی اُس وقت تک عملِ صالح نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی جڑ میں ایمان موجود نہ ہو، اور وہ اُس ہدایت کی پیروی میں نہ کیا جائے جو اللہ اور اُس کے رسولؐ نے دی ہے۔ اِسی لیے قرآن مجید میں ہر جگہ عملِ صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سورہ میں بھی اُس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عمل بلا ایمان پر کسی اجر کی اُمید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے۔ ورنہ ایمان بلا عملِ صالح محض ایک دعویٰ ہے جس کی تردید آدمی خود ہی کر دیتا ہے جب وہ اس دعوے کے باوجود اللہ اور اس کے

رسول کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلنا ہے۔ ایمان اور عملِ صالح کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے۔ جب تک بیج زمین میں نہ ہو، کوئی درخت پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اسی بنا پر قرآن پاک میں جتنی بشارتیں بھی دی گئی ہیں انہی لوگوں کو دی گئی جو ایمان لا کر عملِ صالح کریں، اور یہی بات اِس سورہ میں بھی کہی گئی ہے کہ انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے جو دوسری صفت ضروری ہے وہ ایمان کے بعد صالحات پر عمل کرنا ہے۔ بالفاظ دیگر عملِ صالح کے بغیر محض ایمان آدمی کو خسارے سے نہیں بچا سکتا۔

مذکورۂ بالا دو صفتیں تو وہ ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہئیں۔ اِس کے بعد یہ سورہ مزید دو صفتیں بیان کرتی ہے جو خسارے سے بچنے کے لیے ضروری ہیں اور وہ یہ ہیں کہ یہ ایمان لانے اور عملِ صالح کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اوّل، تو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اُن کے اجتماع سے ایک مومن و صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے، اِس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے، اِس لیے اُس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک، صحیح اور سچی اور مطابقِ عدل و انصاف اور مطابقِ حقیقت بات، خواہ وہ عقیدہ و ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دُنیا کے معاملات سے۔ دوسرے، وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا حق یا خود اپنے نفس کا حق۔ پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کا یہ معاشرہ ایسا بے حس نہ ہو کہ اُس میں باطل سر اُٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہیں۔ بلکہ اس معاشرے میں یہ روح جاری و ساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اُٹھائے کلمۂ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوں، اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راستبازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی

اِس طرزِ عمل کی نصیحت کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال وانحطاط سے بچانے کی ضامن ہے۔ اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ خسران سے نہیں بچ سکتا اور اِس خسران میں وہ لوگ بھی آخرکار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں مگر اپنے معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں۔ یہی بات ہے جو سورۂ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا۔ اور لوگوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا (آیات ۷۸-۷۹)۔ پھر اسی بات کو سورۂ اعراف میں اِس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کھلم کھلا سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں تو اُن پر عذاب نازل کر دیا گیا اور اُس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اِس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے (آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶)۔ اور اِسی بات کو سورۂ انفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ بچو اُس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ (آیت ۲۵)۔ اِسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اُمتِ مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (آل عمران - ۱۰۴) اور اُس اُمت کو بہترین اُمت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے (آل عمران - ۱۱۰)

حق کی نصیحت کے ساتھ دوسری چیز جو اہلِ ایمان اور اُن کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے شرطِ لازم قرار دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اِس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی پیروی اور اُس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، اور اس راہ میں جن تکالیف سے، جن مشقتوں سے، جن مصائب سے اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے اُن کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ اُن کا ہر فرد دوسرے کی ہمت بندھاتا رہے کہ وہ اِن حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم)

تلاشِ حقیقت میں عقل کا سفر

پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

ایک اہم عامل جو عقل کی کارکردگی کو پوری طرح متاثر کرتا ہے، بلکہ اُس کو بالکل نیا رنگ روپ دے دیتا ہے وہ ہے کسی قوم کا مخصوص نظام عقائد اور ایدیات (IDEOLOGY)۔ شمار تو اس کا بھی مبلغ علم میں ہوتا ہے مگر اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا ذکر جداگانہ طور پر کیا جا رہا ہے۔ یہ درحقیقت اس قوم کے افراد کا تہذیبی ورثہ ہوتا ہے۔

زمان و مکان کی وسعت میں معاشرتی اور اجتماعی عقل کا مظہر تہذیب و ثقافت کہلاتا ہے۔ ظاہری محسوس اور مشہود حصہ تہذیب و ثقافت کے نام سے موسوم ہوتا ہے اور باطنی غیر مرئی حصہ چند مابعد الطبیعیاتی عقائد اور تصورات ہوتے ہیں جو اس تہذیب کے لیے بمنزلہ بنیاد اور اساس کے ہوتے ہیں۔ یہ عقائد اور تصورات اس تہذیب کے رگ و ریشہ میں رچے بسے ہوتے ہیں۔ فکر و عمل کا کوئی گوشہ ہو، زندگی کا کوئی مظہر ہو، سب پر بنیادی تصورات کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ ان افکار و تصورات کی جھلک اس تہذیب کے علمبردار افراد، طبقات اور اقوام کے اعمال اور کردار میں صاف نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ واضح بنیادی تصورات کے بغیر کوئی تہذیب آج تک قائم نہیں ہو سکی۔ یہ مابعد الطبیعیاتی تصورات اور عقائد کیا ہیں؟ یہ دراصل حقیقت کبریٰ کی وہ جھلک ہے جو اس مخصوص تہذیب نے دیکھی ہے۔ جو اس مخصوص معاشرہ میں قبولیت عامہ حاصل کر چکی ہوتی ہے۔ مبلغ علم اور خاص طور پر نظام عقائد معاشرہ کے ایک ایک فرد کی ذہنی تشکیل کرتے ہیں۔ ان اذہان سے پھر جو اعمال

صادر ہوتے ہیں۔ ان میں یک رنگی و یکسانیت ہوتی ہے۔ تشکیل ذہنیت کے بعد ہر فرد اپنی رنگین عینک سے اشیاء کو دیکھتا ہے۔ ایک ہی شے کو مختلف تہذیبوں کے افراد مختلف نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہندو گائے کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے اور مسلمان اُس کو دوسری نگاہ سے دیکھتا ہے۔

یہ مبلغ علم اور نظامِ عقائد ہی کا فرق ہے جس کے تحت ایک گروہ نے حقیقتِ کبریٰ کا عکس جلال میں دیکھا اور پھر جلال کی تعبیر آتش سے کی اور آتش پرستی شروع کر دی۔ دوسرے گروہ نے حقیقتِ کبریٰ کا عکس جلال میں دیکھا، مگر جلال کی تعبیر آفتاب سے کی۔ اور پھر آفتاب پرستی شروع کر دی۔ تیسرے گروہ نے حقیقتِ کبریٰ کا عکس جمال میں دیکھا اور جمال کی تعبیر مہتاب سے کی اور مہتاب پرستی شروع کر دی۔ (سومناتھ۔ چاند دیوتا)۔ ایک گروہ نے اس کے حسن و جمال کی تشبیہ اتارنے کی کوشش کی اور بت گری اور مجسمہ سازی شروع کر دی۔ یہ ساری کوششیں نارسائی منزلِ مقصود کی غمازی کر رہی ہیں۔ یہ واماندہ راہ بھٹکے ہوئے قافلۂ فکر و نظر کے پڑاؤ ہیں۔ عقلِ استدلالی فریب خوردگی کا شکار ہوئی ہے۔ یہ سب کچھ صحیح ہے مگر راہی کے سفر کا انکار نہیں ہو سکتا۔ تلاشِ حق کی لگن سے انکار نہیں ہے۔

عقلِ وجدانی اور عقلِ تخلیقی بہر طور تلاشِ حقیقت میں اپنا سفر جاری رکھتی ہیں — عقل و فہم کے لحاظ سے عظیم تفاوت کے باوجود ہر سطح کے لوگ اور ہر مرتبہ کے افراد کے اندر عقلِ تخلیقی کا سفرِ حقیقت جاری رہتا ہے۔ تلاشِ محبوب میں ہر نوع کے افراد سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کی عقلِ وجدانی قوی تر ہوتی ہے۔ ان کے یہاں سفرِ عقلی کے نقوشِ راہ واضح تر ہو جاتے ہیں۔ عوام الناس کے یہاں یہ وضاحت مفقود ہوتی ہے۔ اس عقلی سفر کے دو طریقے ہیں۔ صعودی اور نزولی۔ یہ سفر کبھی کثرت سے وحدت کی طرف ہوتا ہے اور کبھی وحدت سے کثرت کی طرف ہوتا ہے۔ کبھی واقعیت سے مشابہت کی طرف ہوتا ہے اور کبھی مشابہت سے واقعیت کی جانب ہوتا ہے۔

قدیم حکماء کے نزدیک عقلی سفر کے مراحل یہ تھے۔ جمادات، نباتات، حیوانات، ناسوت (عالم انسانیت) ملکوت (فرشتے) لاہوت اور جبروت۔

عام انسان دیکھتا ہے کہ دُنیا میں ایک انسان دوسرے انسان پر غلبہ حاصل کر رہا ہے اس لیے وہ کار فرما طاقت انسان کو سمجھ لیتا ہے۔ جب ذرا گہری نظر سے معاملہ پر غور کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ طاقت و قوت کے مالک ہوتے ہیں بس وہ کار فرما ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ مادی اور جسمانی طاقت کو کار فرما تصوّر کر لیتا ہے۔ مزید غور و خوض سے اس پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مادی طاقت کے خلاف بالآخر ردّ عمل شروع ہو جاتا ہے اس لیے یہ ناقص ہے۔ البتہ اگر طاقت اخلاقی اصولوں کی ہو تو اس کو استحکام اور دوام حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح ایک فہمیدہ انسان دُنیا میں کار فرما قوت اخلاقی قوت کو سمجھتا ہے۔ یہ مادیت سے معنویت کی جانب سفر ہے۔

ایک حکیم کی عقل مزید سفر جاری رکھتی ہے۔ اخلاقی اصولوں سے ترقی کرتے کرتے وہ سمجھتا ہے کہ کائنات میں کار فرما قوت "تصورات" کی ہے۔ (ہیگل) تصور وسعت اختیار کرتے کرتے جب کوئی تصوّر اپنی منطقی حد کو چھو لیتا ہے تو اس کے اندر تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر ایک نیا وسیع تر تصوّر تشکیل پاتا ہے جو اس تضاد کو بھی ہضم کر لیتا ہے۔ یہ تصوّر بھی بالآخر وسعت اختیار کرتے ہوئے اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر تضاد رو نما ہوتا ہے۔ پھر ایک تالیفی تصوّر وجود میں آتا ہے۔ اس طرح تصورات وسیع سے وسیع تر ہوتے جاتے ہیں۔ تصوّرات کا یہ سفر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ روحِ کلی اپنا ظہور کرتی ہے۔ ہیگل کا یہ سفر معنویت سے آفاقیت کی جانب ہے۔ یہ دونوں سفر صعودی ہیں۔

صوفیاء کرام کی عقل وجدانی ایک دوسرے انداز پر اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ یہ کائنات قدرتِ خداوندی کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر آن نئی شان میں جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " زمین اور آسمان میں جو بھی ہیں سب اپنی حاجتیں اس سے مانگ رہے ہیں۔ ہر آن وہ نئی شان میں ہوتا ہے"۔ (رحمٰن۔ ۲۹)۔ اس کے ۹۹ اسمائے حسنہ ہیں۔ اسمائے الٰہی کی تجلّی عالمِ خلق پر پڑتی رہتی ہے۔ بظاہر تو افراد، گروہ، طبقات اور اقوام فعال اور کار فرما نظر آتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت یہ سب اسمائے الٰہی کی تجلیات ہیں۔ اسماء کی تجلّی کبھی جلالی ہوتی ہے اور خلق میں شورش و فساد

رو نما ہو جاتا ہے۔ اسماء الٰہی کی تجلی کبھی جمالی ہوتی ہے اور خلق میں امن و سکون نظر آتا ہے۔ وہ ذات سے واقعیت کی طرف اور وحدت سے کثرت کی طرف سفر جاری رکھتے ہیں۔ ان کا سفر نزولی ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے سمجھایا ہے کہ کس طرح عالمِ امر عالمِ خلق پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب مشیتِ ایزدی کسی کام کا فیصلہ فرما لیتی ہے تو وہ اُس کا ذکر "ملاءِ اعلیٰ" میں کرتی ہے۔ وہ اس کا ذکر "ملاءِ سافل" میں کرتے ہیں۔ پھر یہ بات عالمِ ملکوت میں پھیل جاتی ہے۔ پھر وہاں سے یہ بات عالمِ ناسوت یعنی دُنیا میں پہنچ جاتی ہے اور یہ وہ واقعہ پیش آجاتا ہے۔ اُن کا سفر بھی نزولی ہوتا ہے۔

شعرا اور ادبا واقعیت سے مثالیت کی طرف سفر جاری رکھتے ہیں۔ وہ محبوب کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، حسن و کمال، جمال و جلال، صدق و صفا، عظمت و جبروت وغیرہ حقیقتِ کبریٰ کا کوئی پَر تو جہاں کہیں انہیں نظر آیا، انہوں نے اُس کی توصیف و تعریف، توقیر و تقدیس کرنا شروع کر دی۔ محبوب کے پردے میں درحقیقت وہ مثالی فردیعنی حقیقتِ کبریٰ کے متلاشی ہوتے ہیں۔ وہ مثالی دُنیا یعنی جنت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے اندرونی داعیہ سے وہ حُسن کی ایک تصویر کھینچتے ہیں۔ مثالی صورت قرار دے کر کچھ عرصہ وہ اس کی تعریف و تقدیس میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ پھر اُن کو احساس ہوتا ہے یہ صورت اُن کی باطنی کیفیاتِ حسن سے صحیح طور پر مطابقت نہیں رکھتی ہے، اُن کو اس کے ناقص ہونے کا شعور ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو توڑ پھینکتے ہیں اور پھر ایک نئی صورت گری کرتے ہیں پھر نقص ظاہر ہوتا ہے۔ پھر ایک اور صورت گری کرتے ہیں۔ اس طرح شعراء کا سفر مثالیت کی طرف جاری رہتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس سفر کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

چوں نظر قرار گیرد بہ نگار سے خوب روئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے

ایک دوسرے مقام پر زیادہ واضح الفاظ میں اس سفر کی حقیقت بیان کی ہے۔

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

سے تراشیدم ، پرستیدم ، شکستم

بعض شعرا سفر کے تمام کے تمام مراحل طے کر لیتے ہیں۔ حقیقت کبریٰ تک ان کی رسائی ہو جاتی ہے۔ حقیقت کی جھلک سے وہ بے خود ہوتے ہیں۔ ان کا کلام عارفانہ بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال رح لکھتے ہیں " اعلیٰ ریاضی ، اعلیٰ فلسفہ اور اعلیٰ شاعری کا موضوع حقیقت کبریٰ ہوتا ہے " لیکن بعض شعرا درمیانی مرحلوں میں اور بعض دوسرے شعرا ابتدائی مرحلے ہی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اور وہ مانگ چوٹی کے دام سے باہر نہیں نکلتے۔ بہرکیف شعرا کا سفر مقامیت سے آفاقیت کی طرف ، مادیت سے معنویت کی طرف ، واقعیت سے مثالیت کی طرف جاری رہتا ہے۔ وہ حقیقتِ کبریٰ تک پہنچنے کی پیہم سعی وجہد کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی یہ نغمہ سرائی کسی خارجی مقصد کے لیے نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ وہ اپنے اندرونی جذبہ کی تسکین کے لیے نغمہ سرائی کرتے رہتے ہیں۔

مادی حکما ، سائنسدانوں کا سفر ایک دوسری جہت سے جاری ہے۔ یہ سفر قدیم زمانہ سے جاری ہے۔ عالمِ محسوسات اور مادہ سے انھوں نے آغاز کیا۔ نشاۃ ثانیہ کے مغرب کے تمام حکما " مادہ ہمہ اوست " کا نعرہ لگایا کرتے تھے۔ (امریکی سائنسدان پی ۔ جی ۔ ٹیٹ ۱۸۷۶ء) اور مذہب ، خدا ، آخرت اور اخلاق کی خرافات تصور کرتے تھے (فرانسیسی سائنس داں در کھائم۔ ۱۹۱۲ء) ۔ لیکن فکری مراحل طے کرتے کرتے اب وہ اس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ کائنات کو فانی تصوّر کرتے تھے ہی (آسٹریلوی سائنسدان بولٹزمین ۱۹۶۰) ۔ اب روح اور مادہ کی تفریق کا دَور ختم ہو گیا ہے۔ کائنات کی حقیقت معروضی نہیں ہے بلکہ صراحتاً موضوعی سمجھتے ہیں۔ (انگریز سائنسدان ایڈنگٹن ۱۹۴۱)

سے ارتباط حرف و معنی اختلاطِ جان و تن

مادی حکما کا یہ سفر صعودی ہے۔

حقیقت کبریٰ تک پہنچنے کے لیے مختلف انسانی طبقات مختلف جہات میں سفر

جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس سفر میں نہ معلوم کتنی صدیاں بیت چکی ہیں۔ اور آئندہ کتنی صدیوں تک مزید یہ سفر جاری رہے گا۔ انتہائے سفر کے بعد انسان کس مقام پہ پہنچے گا؟ اس کے جاننے کے لیے عقل انسانی کے پاس کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے البتہ اپنی کتاب قرآن مجید میں اس مقام کے متعلق واضح اشارت فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور اُن کے اپنے نفس میں بھی دکھائیں گے۔ یہاں تک کہ اُن پہ یہ بات کھل جائے گی کہ یہ (قرآن) واقعی حق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے"۔ (حم سجدہ ۔ ۵۳)

اس آیت میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایک دور ایسا آئے گا جب تمام مادّی علوم (آفاق) اور تمام انسانی علوم (انفس) اس حق کی تائید کریں گے جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ یعنی انسانی وضعی علوم ـــ سائنس اور فلسفہ ـــ ترقی کرتے کرتے اس مقام پہ پہنچ جائیں گے کہ وہ وحی الٰہی کی بیان کردہ حقائق کی پوری طرح تائید کریں گے۔ یہ عقل انسانی کی معراج ہے۔ یہ فکرِ انسانی کی منتہائے مقصود ہے۔

روزِ ازل فرشتوں نے ذکر کیا تھا کہ فساد انگیزی اور خوں ریزی انسان کی سرشت ہے اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس اعتراض پر خاموشی اختیار کی اور صرف یہ کہا "کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے"۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ جن نقائص کا تم ذکر کر رہے ہو وہ بھی انسانی سرشت میں ہیں۔ وہ بھی انسان کو عقل فکر اور اختیار و ارادہ عطا کر دینے کا نتیجہ ہے۔ مگر انسانی سرشت میں اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری خوبیاں ہیں، پھر دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھیج دیا کہ وہ فرشتوں کے اعتراض کا عملی جواب دے۔ اس لاکھوں سال کی زندگی میں انسان فرشتوں کا جواب دے رہا ہے۔

انفرادی سطح پہ انبیائے کرام، صلحا اور اتقیا ہر دور میں اور ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہے جن کی پاک اور پاکیزہ زندگیاں وہ بھیں کر۔

ع دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ان کی نفسِ مطمئنہ والی زندگیاں فرشتوں کے اندیشہ کی عملی تردید ہے۔ اجتماعی سطح پر (باقی برصفحہ ۳۰)

"اجماع" بحیثیتِ ماخذِ فقہِ اسلامی

شفقت حسین خادم - ایم اے - شعبۂ علومِ اسلامی یونیورسٹی آف کراچی

(۴)

منکرِ اجماع کا حکم منکرِ اجماع کے سلسلے میں دو باتوں پر سب کا اتفاق ہے۔ ایک یہ کہ اجماعِ ظنی کا منکر کافر نہیں۔ (آمدی جلد ۱ ص ۲۸۲) مثلاً اجماع سکوتی یا وہ اجماع جو بطریقِ آحاد منقول ہو۔ اجماعِ سکوتی باوجودیکہ احناف کے نزدیک قطعی ہوتا ہے لیکن اس کا منکر کافر نہیں۔ اس لیے کہ دونوں میں مخالفت کا موضوع ایسی دلیل ہوتی ہے جو شبہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ (کشف بزدوی جلد ۳ صفحہ ۲۳۲)۔ اگر سلف کا اجماع اس طرح منقول ہو کہ ہم تک پہنچے کہ اس منقول پر ہر عصر کا اجماع ہوتا رہے تو یہ ایسا ہے جیسے حدیثِ متواتر کا نقل۔ اور اگر یہ نقل افراد کے ذریعے ہو تو ایسا ہے جیسے خبرِ واحد کا نقل۔ (نور الانوار جلد دوم صفحہ ۱۱۱) بحر العلوم نے لکھا ہے کہ جو اجماع تواتر کے ساتھ منقول ہو اور اس میں پہلے کوئی مستقر اختلاف نہ ہو تو اُسے اجماعِ قطعی کہتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اجماعِ قطعی جو ضرورتِ دین میں سے کسی مسئلے سے متعلق ہو اور جس کے ادراک میں خواص و عوام سب ہی شریک ہوتے ہیں اس کا منکر کافر ہے۔ (کشف بزدوی جلد ۳ صفحہ ۲۶۲) مثلاً عباداتِ خمسہ یا توحید و رسالت کے اعتقاد کی فرضیت۔ (آمدی جلد ۱ صفحہ ۴) یا نماز میں کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی فرضیت (فواتح جلد ۲ ص ۱۴۳) یا نمازوں میں رکعات کی تعداد یا حج اور روزے کا زمانہ یا زنا، شربِ خمر اور ربوا وغیرہ کی حرمت۔ (کشف بزدوی جلد ۲ ص ۲۶۲)

علامہ تفتازانی نے اس کی تصریح کی ہے کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں کسی کا اختلاف نہیں۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ ان کے سوا دوسری صورتوں میں ہے۔ (تلویح جلد ۲ صفحہ ۴۷) صحابہؓ کا اجماع یا اجماعِ قطعی جو ضروریاتِ دین میں سے کسی مسئلے سے متعلق نہیں اور جس کا ادراک صرف خواص کا کام ہے اُس میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا منکر کافر ہے۔ اور بعض کے نزدیک کافر نہیں۔ (آمدی جلد ۱ صفحہ ۱۴۴، بزدوی جلد ۳ صفحہ ۲۶۱ - ۲۶۲) مثلاً اجارہ کی حرمت (آمدی جلد ۱ صفحہ ۱۴۴) یا کسی عورت کو اس کی پھوپھی، خالہ کے ساتھ جمع کرنے کی حرمت یا قاتل کا وارث نہ ہونا۔ (کشف بزدوی جلد ۳ صفحہ ۲۶۲)۔

اِجماع کی اقسام فقہاکرام نے اِجماع کی مختلف زاویہ ہائے نظر سے متعدد اقسام قرار دی ہیں۔ یہاں ہم چیدہ چیدہ اقسام پر روشنی ڈالیں گے۔

۱۔۔۔ اِجماعِ قولی:۔ اِجماعِ قولی یہ ہے کہ اِجماع کی اہلیت رکھنے والے تمام حضرات کسی زمانے میں اپنے قول سے کسی دینی مسئلے پر اپنا اتفاق ظاہر کریں جیسے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام صحابہؓ نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی اور زبان سے اُس کا اقرار کیا۔

۲۔۔۔ اجماعِ عملی:۔ اِجماعِ عملی یہ ہے کہ اِجماع کی اہلیت رکھنے والے تمام حضرات کسی زمانے میں کوئی عمل کریں۔ جب کوئی عمل تمام اہلِ اِجماع (جائز سمجھ کر) کرنے لگیں تو اُس عمل کو بالاجماع جائز سمجھا جائے گا۔ اِجماع کی اِس قسم سے اُس فعل کا صرف مباح یا مستحب یا مسنون ہونا ثابت ہوگا۔ واجب ہونا اس قسم سے ثابت نہیں ہوسکتا۔ اِلّا یہ کہ وہاں کوئی قرینہ ایسا پایا جائے جس سے وجوب ثابت ہوتا ہو۔ ظہر سے قبل کی چار رکعات جو سنّتِ مؤکدہ ہیں اُن کا سنّتِ مؤکدہ ہونا صحابہؓ کے اجماعِ عملی سے ثابت ہوا ہے (تسہیل الوصول صفحہ ۱۶۸)

۳۔۔۔ اجماعِ سکوتی:۔ اگر ایک مجتہد ایک بات کہے اور یہ بات اُس کے ہمعصروں تک پہنچ جائے لیکن وہ نہ اس کا اقرار کریں نہ انکار، بلکہ سکوت اختیار کریں تو اِصطلاحاً اسے اِجماعِ سکوتی کہا جاتا ہے۔ (ارشاد صفحہ ۶۸) تاہم اگر یہ بات تمام اہلِ عصر تک نہ پہنچے لیکن یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کوئی اس کا مخالف ہے تو اکثر کے نزدیک یہ اجماع ہے اور آمدی کی رائے یہی ہے۔ (آمدی جلد ۱ ص ۱۳۰) یہی تعریف حصول المامول من علم الاصول صفحہ ۳۸ پر

بھی رقم ہے۔

امام بزدوی، نسفی، اور صدر الشریعۃ اجماع سکوتی کو اجماعِ رخصت سے تعبیر کرتے ہیں اور اُس کے مقابلے میں اجماع قولی کو "اجماعِ عزیمت" کہتے ہیں۔ (اصول بزدوی جلد ۳ صفحہ ۲۲۸ تنقیح جلد ۲ صفحہ ۴۱) اجماع سکوتی اس وقت قابلِ اعتماد ہوگا جب کہ اظہار رائے کی عام آزادی ہو۔ پابندی کی صورت میں سکوت کے دوسرے اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔ اس بنا پر صرف رضامندی پر سکوت کا عمل کرنا درست ہوگا۔ یعنی سکوت عادت کی بنا پر ہو تقیہ یا خوف کی بنا پر نہ ہو، نیز یہ کہ اُس سکوت پر مدتِ تامل گزر جائے۔ تمام روایات کے مطابق مدتِ تامل تیس دن ہے۔ (کشفِ بزدوی جلد ۳ صفحہ ۲۸۰، مسلم الثبوت جلد ۲ ص ۲۳۲، نور الانوار جلد ۲ ص ۱۵۴) تاہم نور الانوار کے حاشیہ نگار مولانا عبد الحلیم لکھنوی لکھتے ہیں کہ اکثر احناف کے نزدیک مدتِ تامل کا کوئی تعین نہیں، بلکہ اتنا وقت گزرنا ضروری ہے جس میں عادتاً یہ معلوم ہو جائے کہ اگر کوئی مخالف ہوتا تو اُس مدت میں اپنا اختلاف ظاہر کر دیتا۔ (قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار جلد ۲ صفحہ ۴)

اجماع کی اِن اقسام میں سے پہلی دونوں قسمیں تو سب فقہا کے نزدیک حجت ہیں، البتہ تیسری قسم یعنی "اجماع سکوتی" کے حجت ہونے میں فقہا کا اختلاف ہے۔ (التقریر جلد ۳ صفحہ ۱۰۲) مختلف اقوال مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- نہ یہ اجماع ہے اور نہ حجت۔ یہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے (ارشاد الفحول صفحہ ۸۴) داؤد ظاہری، اُن کے بیٹے ابو عبد اللہ البصری معتزلی اور احناف میں سے عیسیٰ بن ابان اور قاضی ابو بکر باقلانی کا یہی مذہب ہے (کشف بزدوی جلد ۳ صفحہ ۲۲۹) امام غزالی کے نزدیک مختار یہی ہے۔ بشرطیکہ قرائنِ احوال ساکتین کی رضا کو نہ بتائیں۔ (مستصفیٰ جلد ۱ صفحہ ۱۹۱)۔

۲- یہ اجماع بھی ہے اور حجت بھی۔ اہلِ اصول کی ایک جماعت اور بقول آمدی اکثر احناف امام احمدؒ اور بعض شوافع کا بھی یہی مذہب ہے۔ اکثر احناف کے لیے یہ اجماع قطعی ہے۔ لیکن کرخی کا قول یہ ہے کہ یہ ظنی ہے۔ علامہ آمدی بھی اسے ظنی ہی قرار دیتے ہیں (ملاحظہ ہو مسلم الثبوت جلد ۲ صفحہ ۲۳۲، آمدی جلد ۱ صفحہ ۱۲۹)۔

۳ — یہ حجت ہے اجماع نہیں۔ (ارشاد صفحہ ۸۴) امام شافعیؒ سے بھی ایک روایت ایسی ہی ہے اور یہ قول معتزلہ کی ایک جماعت اور کرخیؒ سے بھی منقول ہے (کشف بزدوی جلد ۳ صفحہ ۲۲۹)۔ غزالی نے اسے تحکم سے تعبیر کیا ہے۔ (مستصفیٰ جلد ۱ صفحہ ۱۹۲)

۴ — یہ اجماع بھی ہے اور حجت بھی بشرطِ انقراضِ عصر (ارشاد الفحول صفحہ ۸۴) ایک روایت کے مطابق احمد بن حنبلؒ کی بھی یہی رائے ہے لیکن امام غزالی نے اس قول کو باطل کہا ہے۔ (مستصفیٰ جلد ۱ صفحہ ۱۹۲) "انقراضِ عصر" سے بعض کے نزدیک تمام اہلِ عصر کی موت مراد ہے اور بعض کے نزدیک اکثر کی موت (مستصفیٰ جلد ۱ صفحہ ۱۹۳)۔

۵ — اگر یہ اجماع صحابہ کے زمانے میں ہوا تو حجت ہے ورنہ نہیں۔ (ارشاد صفحہ ۸۴)

۶ — استقرارِ مذاہب سے قبل یہ حجت ہوگا بعد میں نہیں۔ (ارشاد صفحہ ۸۵) استقرارِ مذاہب کے بعد جب یہ معلوم ہوگیا کہ ہر ایک کا مذہب کیا ہے تو ایسی صورت میں اگر کوئی شخص ایک بات کہتا ہے اور دوسرے لوگ خاموش رہتے ہیں تو ان کے سکوت کو اجماع پر محمول نہ کریں گے، بلکہ اس پر محمول کریں گے کہ ان کا اختلاف پہلے سے معلوم ہے۔ (کشف بزدوی جلد ۳ صفحہ ۲۳۱)۔

اجماعِ سکوتی میں یہ تمام صورتیں اس وقت ہیں، جب سکوت عن قول ہو لیکن اگر کسی کا کوئی قول نہ ہو بلکہ اہلِ حل و عقد کسی عمل پر متفق ہو گئے ہوں تو اس میں حسبِ ذیل اقوال ہیں۔

۱ — یہ فعلِ رسولؐ کی طرح ہے، اس لیے کہ اہلِ حل و عقد کے اجماع کے لیے عصمت اسی طرح ثابت ہے جس طرح شارع کے لیے۔ شیخ ابواسحٰق شیرازی کا یہی مذہب ہے اور غزالی نے اسی کو مختار کہا ہے

۲ — یہ ممکن ہی نہیں — جوینی نے قاضی سے یہی نقل کیا ہے کیونکہ ناقابلِ شمار قوم کا کسی ایک فعل پر متحد ہو جانا متصور نہیں ہو سکتا۔

۳ — یہ ممکن ہے لیکن جب تک وجوب کی کوئی دلیل قائم نہ ہو، یہ اباحت پر محمول ہوگا۔ جوینی اسی کے قائل ہیں۔

۴ — اگر یہ فعل، حکم یا بیانِ حکم کے موقع پر ہے تو اس سے اجماع منعقد نہ ہوگا یعنی

اسی کے قائل ہیں (ارشاد صفحہ ۸۵) نیز جو لوگ اجماعِ سکوتی عن قول میں انقراضِ عصر کے قائل ہیں، اُن کے نزدیک فعل میں انقراضِ عصر بدرجۂ اولیٰ شرط ہوگا۔ (مسلم مع الفواتح جلد ۲ صفحہ ۲۳۵)۔ مزید تفصیل (کشف بزودی جلد ۳ صفحہ ۲۲۹، اصول سرخسی جلد ۱ صفحہ ۳۰۴، ۳۰۵، محلی جلد ۲ صفحہ ۱۹۴، فواتح جلد ۲ ص ۲۳۲)۔

بہرکیف زیادہ صحیح مسلک یہ ہے کہ اجماعِ سکوتی بھی حجت ہوتا ہے، جیسا کہ اس کی تائید ذیل کی عبارت سے ہوتی ہے:

"اجماع کی دو قسمیں ہیں: اجماع حقیقی اور حکمی۔ حقیقی یہ ہے کہ مجمع کا اتفاق قولی ہو یا اس ذریعے سے ہو جو قول کے حکم میں ہے جیسے وہ سکوت جو رائے کی تسلیم پر دلالت کرتا ہے اور حکمی وہ ہے جو اس کے خلاف ہو"۔ (از اصول فقہ لمولانا اسمٰعیل شہید)۔ پھر اجماع مذہبی کی دو قسمیں ہیں: ۱- اجماعِ مرکب ۲- اجماعِ غیر مرکب۔

اجماعِ مرکب اجماعِ مرکب یہ ہے کہ پیش آمدہ حادثہ کے حکم پر تو آرا کا اتفاق ہو مگر اس حکم کی علت پر اختلاف ہو۔ مثلاً ایک شخص کو قے بھی آئی اور اس نے مسِ امرأۃ بھی کیا۔ اب احناف و شوافع کا اس حکم پر تو اختلاف نہیں کہ اس کا وضو ٹوٹ گیا، لیکن وضو ٹوٹنے کی علت پر اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک اس کا باعث قے ہے اور شوافع کے نزدیک مسِ امرأۃ ہے۔

اس قسم کے اجماع کا حکم یہ ہے کہ حکم کی ان دو علتوں میں سے اگر ایک فاسد ثابت ہو جائے تو اجماع باقی نہ رہے گا۔ مثلاً اگر دلائلِ شرع سے ثابت ہو جائے کہ قے سے وضو نہیں ٹوٹتا تو چونکہ مسِ امرأۃ سے امام ابو حنیفہؒ کی رائے پہلے ہی عدمی تھی لہٰذا اُن کے نزدیک اس شخص کا وضو بالکل نہیں ٹوٹا اور اجماع باقی نہیں رہا، کیونکہ جس علت پر حکم مبنی تھا وہ فاسد ہو چکی ہے، لہٰذا اجماع بھی ختم ہو گیا۔

اجماعِ غیر مرکب اسے اجماعِ بسیط بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے مُراد یہ ہے کہ بعض اجتہادی مسائل میں مجتہدین کا ایک ہی قول ہوتا ہے۔ مثلاً احناف و شوافع بعض مسائل میں یکسر متفق ہیں وعلیٰ ہذا القیاس۔ پس ان مسائل میں نہ تو حکم کا اختلاف ہے نہ علت کا۔ یہ اجماع چونکہ بہت کم صورتوں میں ہے، نیز علم اصول میں ان چیزوں سے بحث کی جاتی ہے جن میں علماء کا

اختلاف ہے، لہٰذا صاحب اُصول الشاشی نے اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔

اِجماع علی القولین کتبِ اصول میں اجماع علی القولین، اختلاف علی القولین، اور اجماع علی نفی القولِ الثالث تینوں تعبیریں ملتی ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر ایک زمانے کے لوگ کسی مسئلے میں اختلاف کریں۔ لیکن اس مسئلے میں اُن کے صرف دو اقوال ہوں تو آیا کوئی تیسرا قول اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اِس میں اختلاف ہے۔

۱۔ جمہور کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ (آمدی جلد ۱ ص ۱۳۷)

۲۔ بعض شیعہ، بعض حنفیہ اور بعض اہل ظاہر کے نزدیک جائز ہے۔ (آمدی جلد ۱ ص ۱۳۷)

۳۔ رازیؒ اور آمدیؒ کے نزدیک مختار یہ ہے کہ اگر تیسرا قول ایسا ہو کہ اس سے پہلے دونوں قول مرتفع ہوجائیں تو تیسرا قول اختیار کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس میں اجماع کی مخالفت ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس سے پہلے کے دونوں اقوال مرتفع نہ ہوتے ہوں بلکہ یہ تیسرا قول پہلے ہر قول سے کسی اعتبار سے موافق اور کسی اعتبار سے مخالف ہو تو یہ جائز ہے۔ کیونکہ اس میں "فرقِ اجماع" نہیں ہوتا۔ تیسرا قول اختیار کرنے کو اصطلاحاً فرقِ اجماع کہتے ہیں۔ (آمدی جلد ۱ صفحہ ۱۳۷) شوکانیؒ نے لکھا ہے کہ یہ تفصیل امام شافعیؒ سے مروی ہے۔ اور اُن کے اصحاب میں سے متاخرین نے اسے اختیار کیا ہے۔ نیز اصولیین کی ایک جماعت نے جن میں ابنِ حاجب بھی ہیں، اسی کو ترجیح دی ہے۔ (ارشاد صفحہ ۸۶) علاوہ ازیں اسنوی نے شرح منہاج میں اسی کو حق کہا ہے۔ (اسنوی جلد ۲ ص ۲۴۵)۔

اجماع عدم القائل بالفصل اس اجماع کا مطلب یہ ہے کہ دو یا زیادہ مسائل کی اصلی علّت و سبب جب ایک ہو تو اُن کا حکم ایک ہی مانا جائے۔ کیونکہ اُن میں جُدا جُدا حکم لگانے کی کوئی وجہ موجود نہیں۔ ایک علّت اور اصل کے مسلّم ہوجانے کے بعد اس کے ضمن میں آنے والے تمام مسائل کا حکم وہی ہے جو ایک دفعہ مانا جاچکا ہے۔ ایسے تمام مسائل سے متعلق کہا جائے گا کہ اُن میں "اجماع" ہوچکا ہے۔ یعنی اُن کی اصلی علّت مسلّم ہے۔ اس اجماع کی بھی دو قسمیں ہیں:۔

اوّل مجتہدین کے درمیان دو مسائل میں اختلاف ہو لیکن اس اختلاف کا سبب دونوں میں ایک ہی جیسا ہو، یعنی قائلینِ جواز کے نزدیک دونوں جگہ جواز کی ایک ہی علّت ہو اور

قائلینِ عدمِ جواز کے نزدیک دونوں جگہ دوسری علت ہو۔ اب یہ دونوں حضرات اپنے اپنے اُصول کی بنا پر مسائل کی تخریج کریں گے تو کہیں گے کہ ان تمام مسائل پر جواز میں یا عدم جواز میں اجماع ہے۔ یہ اجماع حجت و دلیلِ شرع بن سکتا ہے۔

عدم المقائل بالفصل کی دوسری قسم وہ اجماع ہے جو غیر مقبول ہے اور حجت نہیں بن سکتا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مجتہدین میں دو یا زیادہ مسائل میں اختلاف ہو مگر اختلاف کا منشا ایک نہیں بلکہ زیادہ ہوں۔ اگر سبب و منشا ایک ہوتا تو اس سے بہت سے مسائل کو بطور فرع نکالا جا سکتا تھا۔ اور اب بوجہ اختلافِ منشا ایسا ممکن نہیں۔ اس کے حجت نہ ہونے کا یہی باعث ہے۔

صاحبِ اجماع افراد کا علمی و عملی مقام | صاحبِ اجماع افراد کا علمی اور عملی حیثیت سے معیاری اوصاف کا حامل ہونا ضروری ہے تاکہ قوم اُن کی علمی حیثیت کی بنا پر ان کے فیصلے کو سند کا مقام دینے میں حق بجانب ہو۔ مثلاً:۔

۱ — قرآن حکیم میں حکمت و بصیرت کا درجہ یا کم از کم علم کا مقام حاصل ہو۔ صرف ترجمہ و تفسیر بیان کر لینا کافی نہیں۔

۲ — سنّتِ نبوی کو روایت و درایت کے معیار سے جانچنے کے طریقے سے پوری واقفیت اور اس کے صحیح مقام و محل کے تعیّن کی معرفت ہو۔

۳ — صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے واقفیت اور ان کے اجماع اور فیصلے کا علم ہو۔

۴ — قیاس کے ذریعے استنباط کے اُصول و قواعد معلوم ہوں۔

۵ — قوم کے مزاج، حالات و تقاضوں، رسم و رواج اور عادات و فضائل سے بھی واقفیت ہونا ضروری ہے۔

۶ — جدید رجحانات اور تقاضوں سے واقفیت کے لیے ایسے حضرات کو شامل کیا جائے جو ان معاملات میں سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ رائے دے سکیں۔ چنانچہ تصریح ہے، فنی اجماع میں ان ہی لوگوں کے اجماع کا اعتبار ہوگا۔ جنہیں فن میں بصیرت حاصل ہو۔ اہلِ فن کے علاوہ اور کسی کے اجماع کا اعتبار نہ ہوگا۔ اس لحاظ سے فقہی مسائل میں فقہا، اُصولی

مسائل میں اصولیین، اور نحوی مسائل میں نحویوں ہی کے قول کا اعتبار ہوگا۔ ان کے ماسوا جو ہوں گے اُن کا شمار عوام میں کیا جائے گا۔ (حصول المامول من علم الاصول صفحہ ۵۴)۔

اجماع کے اختیارات کی وسعت

باقاعدہ اجماع منعقد ہونے کی بنا پر اسلام کے عملی نظام میں اہلِ تفقہ کو کافی اختیارات حاصل ہیں۔ اس ضمن میں فقہا کے مختلف اقوال جمع کر کے ان میں باقاعدہ تطبیق و ترجیح سے درج ذیل اختیارات سامنے آتے ہیں:

۱۔ حالات اور تقاضوں کی مناسبت سے نئے قوانین وضع کرنا۔ ۲۔ پُرانے اجماعی فیصلے جو حالات و مصالح کے تابع تھے۔ اُن میں موجودہ حالات و مصالح کے پیشِ نظر مناسب ترمیم کرنا۔ ۳۔ وہ احکام جو بتدریج نازل ہوتے ہیں، معاشرتی حالات کے لحاظ سے انہیں مقدم و مؤخر کرنا۔ ۴۔ وہ احکام جن میں عرب کے مقامی حالات، رسم و رواج اور خصائل و عادات ملحوظ ہیں۔ ان کی رُوح اور پالیسی برقرار رکھتے ہوئے جدید حالات کے پیشِ نظر ان کے لیے نیا قالب تیار کرنا۔ ۵۔ وہ احکام جو وقتی تقاضے اور مصلحت کے تحت ہیں ان میں موجودہ تقاضے اور مصلحت کے تحت مناسب ترمیم کرنا۔ ۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جن احکام میں مختلف الرائے ہیں معقول دلیل کی بنا پر اُن میں کسی ایک کو ترجیح دینا۔ ۷۔ فقہا کی مختلف آراء میں معاملات اور تقاضوں کی مناسبت سے ترجیح کی صورت پیدا کرنا وغیرہ۔

چنانچہ کتبِ اُصول میں تصریح ہے کہ "اجماع خبرِ مشہور سے زیادہ قوی حجت ہے جب خبرِ مشہور سے نسخ جائز ہے تو اجماع سے بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا"۔ نیز لکھا ہے کہ "تبدیلی کی یہ صورت ہے کہ پہلا اجماع کسی مصلحت پر مبنی ہو تو پھر جب وہ مصلحت بدل جائے گی تو اجماع دوسری مصلحت پر مبنی ہو کر پہلے کے خلاف منعقد ہوگا"۔ (التقریر والتحبیر جلد ۳ صفحہ ۷۹)۔

بنیادی اُصول اور کُلی پالیسی کی اہمیت

اجماع مجموعی حیثیت سے ہدایتِ الٰہی کی کلی پالیسی اور بنیادی اُصول کے ماتحت ہونا چاہیے۔ علیحدہ علیحدہ قرآن و سنّت میں اس کی سند ضروری نہیں ہے، ورنہ اجماع سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ یعنی جس امر پر اجماع ہوا ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ قرآن و سنّت میں اُس کے لیے مستقل سند موجود ہو، بلکہ اس کا اسلام کے بنیادی اُصول اور اس کی کُلی پالیسی کے تحت ہونا کافی ہے۔ کیونکہ اگر سند مستند ہے تو وہ خود اپنی جگہ مستقل

طرزِ عمل کی داعی ہے۔ اجماع کے ذریعے اس کو اور زیادہ مستقل بنانے کا دعویٰ سند اور اجماع دونوں کی اہمیت کو کم کرتا ہے۔ اور اگر سند غیر مستند ہے کہ اس سے عمل کی تاکید ثابت نہیں ہوتی تو اجماع سے بے شک وہ زیادہ قوی بن جائے گی۔ اسی طرح اگر قوی اور ضعیف کسی قسم کی سند موجود نہیں ہے، لیکن فلاح و بہبود کے عام اصول سے اس کا تعلق ہے یا عمومی پالیسی اور حکمت کے خلاف نہیں ہے تو اس قدر بھی اجماع کے لیے کافی ہے۔ فقہا کی درج ذیل تصریح سے مذکورہ اصول پر روشنی پڑتی ہے:-

"اجماع کو اس امت کی ضرورت کے پیشِ نظر بطور اعذار کے حجت مقرر کیا گیا ہے، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے۔ اب اگر امت کے سامنے ایسی صورت پیش آئے کہ اس میں صریح نص موجود نہیں ہے تو لامحالہ وہ اجتہاد پر عمل کرنے پر مجبور ہوگی اور اجتہاد میں خطا کا بھی احتمال ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اجتہاد خطا پر ہی ہو۔ ایسی صورت میں جب امت اس پر عمل کرے گی تو ساری امت کا حق سے نکل جانا لازم آئے گا اور یہ جائز نہیں ہے۔ نیز تجدید رسالت کی ضرورت ہوگی جو اب ممکن نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسولؐ کے خاتم الانبیاء ہونے کی خبر دے دی ہے۔ غرض اسی صورت کو پورا کرنے کے لیے اجماع کو حجت بنایا گیا ہے۔" (التقریر والتحبیر جلد ۳ صفحہ ۱۱۲)۔

اجماع پر اعتراضات

اجماع کے خلاف اعتراضات بھی ہیں:-

۱۔ نظام معتزلی کے نزدیک اجماع کا ہونا محال ہے کیونکہ تمام علماء کا ایک ایسے مسئلے پر متفق ہونا جو پہلے سے معلوم نہ ہو ممکن نہیں ہے۔

۲۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی وقت میں تمام علما اکٹھے ہو کر کسی مسئلے پر گفتگو کر سکیں۔

۳۔ نظام نے ایک دلیل یہ بھی پیش کی ہے کہ علماء مختلف ممالک میں دور دراز مقامات پر رہتے ہیں، لہٰذا کسی مسئلے پر ان سب کی رائے معلوم کرنا ناممکن ہے۔

۴۔ بعض لوگوں نے یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ اجماع کے فیصلوں کی تشہیر کا کوئی معقول

ذریعہ نہیں ہے۔

لیکن مذکورہ بالا دلائل پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب سطحی ہیں اور ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اجماع کا ہونا محال ہے۔ اگر مخلصانہ کوششیں کی جائیں تو ان مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اگر کسی مسئلے کو مذہبی دلائل سے ثابت کیا جائے تو علماء اس پر متفق ہو جائیں۔ اگر موجودہ دور میں مواصلات اور رسل و رسائل کے جدید وسائل کو کام میں لایا جائے تو جغرافیائی فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ موجودہ زمانے میں بین الاقوامی کانفرنسیں اور اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں جن میں دنیا بھر کے ماہرین سیاسی قانونی، اقتصادی اور علمی موضوعات پر بحث تمحیص کے بعد متفقہ تجاویز منظور کرتے ہیں اور عالمی پریس کے ذریعے دنیا بھر میں ان کی تشہیر ہو جاتی ہے لہٰذا مذہبی معاملات اور ممالک اسلامیہ کے دیگر مسائل کو حل کرنے کے لیے اگر علماء ملت کا بین الاقوامی اجلاس طلب کیا جائے تو اجماع عملاً ممکن ہو جائے گا۔ اور جب علماء کرام کسی امر پر اجماع کر لیں تو اس پر عمل کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگا۔

شریعت اور اجماع کی قانونی حیثیت بعض حضرات بے جا طور پر یہ خیال کرتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ نے اجماع کو قانونی حیثیت دے کر انفرادیت اختیار کی ہے، جب کہ تمام غیر اسلامی ممالک میں بھی مروج جدید قوانین کی تطبیق اور تشریح میں اجتماعی رائے کو اساس کا درجہ حاصل ہے۔ ان ممالک میں قوانین کا اجرا اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک قانون ساز اداروں کی اکثریت اُن سے اتفاق نہ کرے اور جن قانونی نظریات پر ماہرین قانون اور عدالتوں کے ججوں کا اتفاق ہوتا ہے اُن کو قانون سے کمتر درجے کی قوتِ نافذہ حاصل ہو جاتی ہے۔ جس کا منبع یہی نامکمل اجماع ہوتا ہے۔ اگر ججوں کی آراء میں اختلاف ہو تو جدید قوانین اکثریت کی رائے کے حق میں فیصلہ دے دیتے ہیں، چنانچہ اگر عدالت تین ارکان پر مشتمل ہو تو وہ رائے فیصلہ کن ہوگی جس پر دو متفق ہوں اور اگر عدالت ہائے عالیہ میں کسی قانونی اُصول کے مفہوم کے تعین میں اختلاف ہو جائے یا دفعات کی تعبیر متنازعہ فیہ ہو جائے تو فیصلہ تمام عدالتوں کے ججوں کی اکثریت کی رائے کے مطابق ہوتا ہے۔ اس بیان کا یہ مطلب ہوا کہ جدید قوانین نہ صرف یہ کہ اجماع کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس نامکمل اجماع کو بھی قانون سازی، تطبیق اور تعبیر میں ماخذ تصور

کرتے ہیں جو اکثریت کی رائے کا حامل ہو۔

اجماع کا فائدہ

سندِ شرعی کے ساتھ اجماع کے کئی فوائد ہیں:۔ سند کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک قطعی مثلاً کتاب اللہ کی آیت یا خبر متواترہ، دوسرے ظنی مثلاً خبرِ واحد یا قیاس۔ اگر سند قطعی ہے تو اجماع کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی مزید تاکید ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک ہی حکم کے متعلق کتاب اللہ کے دو یا زائد نصوص ہوں، یا کتاب اللہ میں کوئی نص ہو اور خبر متواترہ بھی موجود ہو۔ تب حکم ایک ہی نص سے قطعیت کے ساتھ ثابت ہو جاتا ہے۔ لیکن باقی نصوص تاکید کا فائدہ بخشتے ہیں۔ اگر سند ظنی ہو تو اس کے دو فوائد ہیں۔ ایک یہ کہ انعقادِ اجماع کے بعد نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے، نہ اس دلیل سے حکم کا ثبوت ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انعقادِ اجماع سے قبل اس دلیل کے ظنی ہونے کی وجہ سے مخالفت جائز ہے، لیکن انعقادِ اجماع کے بعد یہ دلیل قطعی ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کی مخالفت حرام ہوتی ہے (کشف بزودی جلد ۳ صفحہ ۲۶۵)۔

(مؤلف نے کتابیات کی بڑی جامع فہرست دی ہے، مگر وہ یہاں دی نہیں جا سکی۔ مدیر)

(بقیہ: تلاشِ حقیقت میں عقل کا سفر)

وقفہ وقفہ سے ایسے صالح معاشرے قائم ہوتے رہے ہیں جہاں کی زندگی حیاتِ طیبہ تھی۔ جہاں نہ خوف تھا نہ حزن۔ جہاں اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا تھا۔ اور جو آخری زمانہ میں تمام ادیانِ باطلہ پر غالب آجائے گا۔ شرعی سطح پر ایک زمانہ آئے گا جب انسان سائنس اور فلسفہ سے اپنے طور پر حق پرستی کا اثبات کرے گا۔ یہ انسانی فکر کی معراج ہوگی۔ پھر آخرت میں اللہ تعالیٰ ان تینوں سطح کے عملی جوابات فرشتوں کے اندیشہ کے مقابلے میں پیش کرے گا اور کہے گا کہ میں نے نہیں کہا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ہو۔ اسی وقت انسان کو یہ اعزاز و تکریم حاصل ہوگی کہ وہ کہ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ (القمر۔ ۵۵) متقی لوگ باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔ سچی عزت کی جگہ۔ اقتدار والے بادشاہ کے قریب۔ اس دن انسان خداوند تعالیٰ کے پاس کرسی نشین ہوگا۔ یہ بڑے سے بڑا اعزاز ہوگا جو کسی مخلوق کو حاصل ہو سکتا ہے۔

زکوٰۃ ——— نظریہ اور عمل

محمد عتیق اللہ - جدّہ

(۳)

مویشی کی زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر میں زکوٰۃ کی ابتدا چرندے جانور (اونٹ گائے اور بکرے) کی زکوٰۃ سے ملتی ہے۔ یہاں ٹیبل نمبر ۱ میں اونٹ کی زکوٰۃ کی تشریح کی گئی ہے۔ اس ٹیبل میں اونٹ کی تعداد (نر یا مادہ)، عفو کی حد (جنس نر ہو یا مادہ) زکوٰۃ اور زکوٰۃ میں لیے جانے والے جانور کی عمر درج کی گئی ہے۔ علامت الف تا ب کا مفہوم ہے کہ الف اور ب کا درمیانی نمبر جس میں الف بھی ہو سکتا ہے مگر ب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ۲۰ — ۲۵ کا مفہوم ہم یہ لیں گے کہ ۲۰ سے لے کر ۲۵ تک جس میں ۲۵ داخل نہیں ہے۔

ٹیبل نمبر ۱ اونٹ کی زکوٰۃ

عنوان	تعداد اونٹ (نر یا مادہ)	زکوٰۃ	عمر	ریمارک
عفو	۰ — ۵	صفر		
سلیب اول	۵ — ۲۵	بکرا ایک (نر یا مادہ)	۱ سے ۲ سال	ہر پانچ اونٹ کی زکوٰۃ ایک بکرا
سلیب دوم	۲۵ — ۳۵	اونٹ ۱ (مادہ)	۱ سے ۲ سال	
	۳۵ — ۴۵	اونٹ ۱ (مادہ)	۲ سے ۳ سال	
	۴۵ — ۶۰	اونٹ ۱ (مادہ)	۳ سے ۴ سال	
	۶۰ — ۷۵	اونٹ ۱ (مادہ)	۴ سے ۵ سال	

سلیب سوئم	۷۵ — ۹۰	اونٹ ۲ (مادہ)	۲ سے ۳ سال
	۹۰ — ۱۲۰	اونٹ ۲ (مادہ)	۳ سے ۴ سال

ٹیبل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ۵ سے کم اونٹ پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ سلیب اوّل میں ہر پانچ اونٹ کی زکوٰۃ ایک بکرا ہے، جس کی عمر ا سے ۲ سال ہو۔ اسی طرح ۲۴ اونٹ کی زکوٰۃ ۴ بکرے ہے۔ سلیب دوئم میں ہر گروپ کی زکوٰۃ ایک اونٹنی مخصوص عمر کی ہے۔ اسی طرح سلیب سوئم میں ہر گروپ کی زکوٰۃ دو اونٹنی مخصوص عمر کی ہے۔ اگر اونٹ کی تعداد ۱۲۰ سے تجاوز کرتی ہے تو سلیب کی مدد سے زکوٰۃ کا حساب نکالا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۳۰ اونٹ کی زکوٰۃ نکالنے کے لیے ہم ۱۳۰ کی تعداد کو سلیب کی مناسبت سے اس طرح لکھ سکتے ہیں کہ ۱۲۰ + ۵ × ۲ اور اسی کے مطابق سلیب دوم سے زکوٰۃ نکال سکتے ہیں ۲ مادہ اونٹ ۳ سے ۴ سال کی عمر اور سلیب اوّل سے ۲ بکرا ا سے ۲ سال کی عمر۔ اگر تعداد ۱۵۰ سے بڑھتی ہے تو ۵۰ کے عدد ضربی پر ہم لکھ سکتے ہیں ۵۰ × ۳ + ۵ × ۲ جس سے زکوٰۃ نکلتی ہے ۳ اونٹ (مادہ) عمر ۳ سے ۴ سال اور ۲ بکرا عمر ا سے ۲ سال۔ اسی طرح ۱۹۶ اونٹ کی زکوٰۃ معلوم کرنے کے لیے ہم لکھ سکتے ہیں۔ ۵۰ × ۳ + ۴۶ اور سلیب دوئم سے حساب لگا سکتے ہیں۔ چار اونٹ (مادہ) اور ہر ایک کی عمر ۳ سے ۴ سال۔ طریقہ آسان ہے۔ ہر ۵۰ کے عدد ضربی پر ایک اونٹ (مادہ)، عمر ۳ سے ۴ سال اور ہر ۵ کے عدد ضربی پر ایک بکرا (نر یا مادہ) عمر ا سے ۲ سال۔

جب ہم زکوٰۃ کے ٹیبل پر غور کرتے ہیں تو کچھ باتیں سوال بن کر سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات یہ سامنے آتی ہے کہ کسی کے پاس اونٹ کی تعداد میں، نر، مادہ یا دونوں جنس ہوسکتی ہے۔ مگر مگر زکوٰۃ میں مخصوص جنس (صرف مادہ اونٹ) قبول کیا جاتا ہے اور اس کی بھی عمر کم رکھی گئی ہے۔ اس میں مصلحت کیا ہے؟

دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ ٹیبل میں زکوٰۃ کی درجہ بندی سلیب کی صورت میں کی گئی ہے۔ سلیب کا تصور دورِ جدید کی پیداوار ہے جو انکم ٹیکس اور معاشیات میں

کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے ٹیبل کا ایک خاکہ اس رسولِ برحق نے عطا فرمایا جس کو قرآن کے رو سے "اٰتوا" کہتے ہیں۔ ٹیبل میں پنہاں ایک ایسا فارمولا ہے جس سے اونٹ کی بڑی تعداد کی زکوٰۃ کا حساب آسانی سے لگایا جا سکتا ہے، اس فارمولا کا مقصد کیا ہے؟

آگے کی گفتگو میں ہم یہ باتیں مزید سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے پہلے ٹیبل ۲ اور ٹیبل ۳ کا مطالعہ ضروری ہے ہوتا ہے۔ ٹیبل ۲ کا تعلق گائے و بیل اور ٹیبل ۳ کا تعلق بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ سے ہے۔

ٹیبل ۲: گائے و بیل کی زکوٰۃ

تعداد جانور	زکوٰۃ	عمر	ریمارک
۰۔۳۰	معاف		
۳۰ کی ضربیٗ	بچھڑا ایک (نر یا مادہ)	۱ سے ۲ سال	ہر ۳۰ گلہ پر ایک بچھڑا
۴۰ کی ضربی	بچھڑا ایک (نر یا مادہ)	۲ سے ۳ سال	ہر ۴۰ کے گلہ پر ایک بچھڑا

۳۰ سے کم تعداد پر زکوٰۃ معاف ہے۔ جب تعداد ۳۰ کی گلہ بنتی ہو تو ہر گلہ کی زکوٰۃ ایک بچھڑا ہے جس کی عمر ۱ سے ۲ سال ہو۔ اگر تعداد ۴۰ کے گلہ پر بنتی ہو تو ہر گلہ کی زکوٰۃ ایک بچھڑا ہے جو ۲ سے ۳ سال کا ہو۔ مثال کے طور پر ۷۰ گائے کی زکوٰۃ ۲ بچھڑا ہے، ایک کی عمر ۱ سے ۲ اور دوسرے کی عمر ۲ سے ۳ سال ہوتی ہے، کیونکہ ۷۰ کو ہم تیس^۳۰ اور چالیس^۴۰ کے مجموعہ کے برابر لکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ۱۲۰ گائے کی زکوٰۃ ۴ بچھڑا (ہر ایک کی عمر ۱ سے ۲ سال) یا ۳ بچھڑا (ہر ایک کی عمر ۲ سے ۳ سال) ہے۔

۱؎ "ضربی" کی اصطلاح کا مفہوم واضح نہیں۔

ٹیبل ۳ : بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ

تعداد جانور	زکوٰۃ	عمر	ریمارک
۰ — ۴۰	معاف		
۴۰ — ۱۲۰	۱ (نر یا مادہ)	۱ سے ۲ سال	
۱۲۰ — ۲۰۰	۲ (نر یا مادہ)	۱ سے ۲ سال	
۲۰۰ — ۴۰۰	۳ (نر یا مادہ)	۱ سے ۲ سال	
۴۰۰ — ۵۰۰	۴ (نر یا مادہ)	۱ سے ۲ سال	
۵۰۰ اور زیادہ	...... ہر ۱۰۰ کے ریوڑ پر ایک جانور ۱ سے ۲ سال کی عمر کا۔		

بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ نکالنا آسان ہے۔ معافی کی حد ۴۰ ہے۔ اس سے کم پر زکوٰۃ معاف ہے۔ پانچ سو سے زیادہ کی تعداد کو سو سو کے ریوڑوں میں محسوب کر کے زکوٰۃ کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ۵۹۰ جانوروں کی تعداد ہم لکھ سکتے ہیں۔ ۱۰۰ × ۵ + ۹۰[1]۔ پانچ سو کی زکوٰۃ ۵ جانور ہے (عمر ۱ سے ۲ سال) اور باقی ۹۰ پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ اس کو ٹیکس ریلیف یا "عفو" کہتے ہیں۔

اونٹ گائے اور بکرے کی زکوٰۃ کے بعد سونے اور چاندی کی زکوٰۃ کا مطالعہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مختلف مسلم ممالک میں مقامی وزن یا قیمت میں زکوٰۃ کا حساب لگایا جاتا ہے ہم چاہیں گے کہ زکوٰۃ معلوم کرنے کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے سارے مسلم ممالک میں وحدت قائم ہو سکے۔

سونے اور چاندی کی زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق سونے اور چاندی پر سالانہ زکوٰۃ ہے، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ زیور ہو یا سکے کی صورت میں ہو۔ زکوٰۃ وزن

[1] زیادہ مناسب صورت یوں ہوتی (۵۹۰ — ۹۰) × ۱/۱۰۰

یا قیمت میں ادا کی جا سکتی ہے ۔ عفو کی حد سونے پر ۲۰ مثقال اور چاندی پر ۲۰۰ درہم ہے ۔ خلیفہ اول ، حضرت ابوبکر صدیق کے زمانہ تک مثقال اور درہم کے تبادلہ کی مختلف شرحیں استعمال ہوتی تھیں ۔ (۵ ، ۶ اور ۱۰ مثقال ۱۰ درہم کے برابر تھے) ۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ بن خطاب نے مثقال اور درہم کے تبادلہ کی مختلف شرح کو ایک معیاری شرح میں تبدیل کر دیا ۔ آپ نے ۵ ، ۶ اور ۱۰ مثقال کے اوسط ، مثقال کو ۱۰ درہم کے مساوی قرار دیا ۔ ایک 'صاع' غلہ تقریباً ۲۰ ، مثقال کے برابر برقرار رہنے دیا ۔ لفظ مثقال اور صاع کا ذکر قرآن میں آیا ہے ۔ فقہ کی کتب میں یہ الفاظ کثرت سے ملتے ہیں ۔ ان کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے بڑی آسانی ہوگی ۔ اگر ہم ان کی ماہیت ایک بین الاقوامی اکائی میں بیان کر سکیں ۔ اس کی عملی افادیت ظاہر ہے ۔

مثقال اور درہم قیراط میں تبدیل کیے جا سکتے ہیں ۔ ایک مثقال ۲۰ قیراط کے برابر ہے اور ایک درہم میں ۱۴ قیراط ہوتے ہیں ۔ اس طرح ، مثقال اور ۱۰ درہم مساوی ہیں ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم ممالک میں قیراط کا تصور کیا ہے ؟ ہند و پاک کے علما کے نزدیک ایک قیراط پانچ جو (الشعیرہ) کے برابر متعارف ہے ۔ زکوٰۃ کے وزن میں رتی ، ماشہ اور تولہ کا اعتبار ہے ۔ ان اوزان اور مقدار پر ڈاکٹر صغیر حسین معصومی نے (۱۹۷۹ء میں) اچھی روشنی ڈالی ہے ۔ اس وقت تقریباً ہر مسلم ملک میں ملی گرام ، گرام اور کلوگرام رائج ہے ۔ ہم ان اوزان میں قیراط اور عفو کی حد سمجھنے کی کوشش کریں گے ۔

ایک انگریزی لغت ، نیو ویبسٹر کالج ایڈیشن (۱۹۸۲ء) میں لفظ "کیرٹ" (CARAT.) کی تشریح کی گئی ہے کہ اس لفظ کا ماخذ عربی کا لفظ "قیراط" ہے جو دو سو ۲۰۰ ملی گرام کا ایک معیاری پیمانہ ہے ۔ یہ قیمتی پتھر تولنے کے لیے ہے ۔ لغت میں یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ "کیرٹ" ایک درخت کے پھل کا بیج ہے جس کو عربی میں 'خرّوب' کہتے ہیں ۔ بہرکیف قیراط کے حوالہ سے ملی گرام یا گرام کے وزن میں ہم مثقال ، درہم اور صاع کو اس طرح لکھ سکتے ہیں کہ :-

(باقی صفحہ ۵۵)

ہند چینی کے مسلمانوں پر کیا گذری؟

مترجم:- نور الاسلام صاحب - منصورہ - لاہور

ماخوذ:- از مجلہ اتحاد - امریکہ

(۲)

کمبوڈیا میں چم کے مسلمان

کمبوڈیا میں مسلمان ۱۸۲۳ء کے بعد نظر آنے لگے جب اُن کے بادشاہ نے بھاگ کر وہاں پناہ لی - اس کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں مختلف طبقوں کے لوگوں نے گاؤں بسا لئے - وہ ایک مذہب، ایک رسم ورواج، ایک زبان میں بندھ گئے تھے - اور اپنی قسمتیں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دی تھیں - سالہا سال کے اس تعلق نے ایک متحدہ لیڈرشپ قائم کر دی جو لوگوں کی مذہبی زندگی کی دیکھ بھال کر سکتی تھی - مگر اُن کی تگ ودو حکومت کمبوچیا کی وزارت بدھ مت کی پابندیوں کی مخالفت تک محدود تھی -

کمبوچیا میں مسلمانوں کی تعداد

کمبوچیا کی حکومت پہلے بہت سے ایسے حربے استعمال کرتی تھی کہ مسلمانوں کی موجودگی اور اُن کی تعداد دُنیا کے مسلمانوں سے چھپی رہے - مثلاً حج پر بہت کم تعداد میں مسلمانوں کو بھیجنا، اور جن کو اجازت مل جائے اُن کے راستے میں روڑے اٹکانا، مسلمان طالب علموں کو مسلمان ملکوں میں اسلامی تعلیم کے لیے جانے سے روکنا - (سوائے معدودے چند کے) اور مردم شماری میں مسلمانوں کی کل تعداد اس سے کم دکھانا جتنی کہ تھی - اس وجہ سے ہم کو سرکاری مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد کبھی ۵۰ لاکھ یا ۶۰ لاکھ ملتی ہے - حالانکہ ان کی اصلی تعداد ایک کروڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی -

مسلمانوں کی معاشرتی زندگی

چم کے مسلمانوں اور ان کے پڑوسی بدھوں میں بہت ہی فرق تھا۔ مذہب میں بھی، زبان، روزمرہ کی زندگی اور شہری رسم و رواج میں بھی چم علیحدہ گاؤں بسا کر رہتے تھے جن کو کیمپُم چام کہتے تھے یا "چاموں کے گاؤں"۔ ہر گاؤں میں باجماعت نماز پڑھنے کا انتظام تھا۔ مسجدیں دُور دراز جگہوں پر ہونے کی وجہ سے نماز باجماعت کا انتظام کسی جگہ کر لیا جاتا تاکہ دیہاتی لوگ محروم نہ رہیں۔ ایسے تمام گاؤں جن میں مسجدیں نہیں تھیں، اور مسلمان خاصی تعداد میں تھے، اُن میں گاؤں کے بیچ میں ایک کھلی جگہ نماز کے لیے مقرر کر لیتے تھے۔ جمعہ کے دن باجماعت نماز پڑھنے کے لیے زیادہ بڑی جگہ الگ مقرر کی جاتی تھی۔ آج تک بڑے بڑے گاؤں میں تقریباً ۱۳۲ مساجد پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ چام گاؤں ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھتے تھے اور کمپوچین گاؤں سے اُن کو علیحدہ شمار کیا جاتا تھا۔ مذہبی اختلاف کی وجہ سے ان دو قسموں کی آبادی کے درمیان شادی بیاہ کا تعلق نہیں تھا۔ یعنی شادی کے رسم و رواج اور طلاق اور وراثت کے قاعدے الگ تھے۔ جب تک کہ ایک غیر مسلم، مسلمان نہ ہو جاتا یہ تعلق ممکن نہ تھا۔ ہر نومسلم شخص چم کے لوگوں کے ساتھ پوری طرح گھل مل جاتا تھا، اُن کی زبان سیکھتا، ان کے سے کپڑے پہنتا، ان کے رسم و رواج سیکھتا، غرضیکہ پورا چم بن جاتا۔ کمبوڈیا کے لوگ جو اس طرح مسلمان ہوتے، بہت کم تھے۔

ایک نومسلم شخص اسلام کے اُصول سیکھ کر ایک دو معاونوں کے ساتھ پھر چم کے تمام دیہات میں لوگوں سے واقفیت پیدا کرتا تھا۔ یہ شخص اور اس کے معاون پھر اُن لوگوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی کی نگہداشت کرتے تھے۔ ایسے لوگ اپنے لیے امام اور خطیب اور موذن مقرر کر لیتے۔ چند ہی روز میں سب مل کر کسی ایسے آدمی کو نماز پڑھانے کے لیے چُن لیتے تھے جو بہترین طریق سے قرآن مجید پڑھ سکتا ہو اور مسئلہ مسائل سے بخوبی واقف ہو۔ اس طرح مقرر ہونے والے امام حضرات اپنے فرائض بغیر کسی اُجرت کے ادا کرتے تھے۔ کیوں کہ یہ ذمہ داری اس میں حائل نہ تھی کہ کوئی دوسرا مشغلہ اختیار کر کے وہ اپنے لیے روزی کمائیں۔ وہ امامت کے فرائض ادا کرنے کی کوئی اُجرت نہ لیتے تھے۔ ایسے دیہات

کی تنظیم ایک اعلیٰ مسلم کونسل کے سپرد تھی۔ امام اُس کا چیئرمین ہوتا تھا، جو شریعت سے بخوبی واقف ہوتا تھا۔ اور اپنے معاونین اور شوریٰ پر اثر رکھتا تھا۔ یہ کونسل براہِ راست وزارتِ اُمورِ بدھ مت کے تحت تھی۔

دو گروپ مارچ ۱۹۷۰ء کے واقعات کے بعد (جب کہ حکومت بدل گئی) کمبوڈیا میں دو گروپ بروئے کار آئے۔ ایک مرکزی اسلامک ایسوسی ایشن، دوسرا نوجوان مسلمانوں کی تنظیم۔ پہلی تنظیم کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو صحیح مذہبی تعلیم دی جائے اور اسلام کے اُصولوں کے مطابق زندگی گذارنے میں اُن کی معاونت کی جائے۔ دوسرے گروپ نے اپنے ذمہ یہ کام لیا کہ نوجوانوں کو کمبوڈیا کے مختلف حصوں میں منظم کیا جائے، ان کو متحد کیا جائے۔ اُن کے تعلیمی، معاشرتی، مذہبی اور دوسرے مسائل کو سمجھا جائے اور غریب طلبا کے لیے دارالسلطنت میں اور دوسرے علاقوں میں ہوسٹل بنائے جائیں۔

یہ دونوں گروپ، باوجود ان کے موجودہ خاندانی تعلق کے، اسلام اور کمبوڈیا کے مسلمانوں کی برابر خدمت کر رہے تھے۔ اس خدمت کی اہمیت خاص طور پر ویت نام سے لڑائی کے دوران میں صحیح ثابت ہوئی جب کہ ہزاروں مسلمان کمیونسٹ مقبوضہ علاقوں سے نکل کر اُن علاقوں میں آگئے جو نوم پین (PHNOM PENH) کے نزدیک تھے۔ یہاں وہ بہت غربت کی حالت میں رہنے لگے۔ اسلامک ایسوسی ایشن کے ایک گروپ نے اِن جاں کاہ حالات کا مقابلہ خدمتِ انسانیت اور امدادی کاموں سے کیا۔ انہوں نے اپنی سرگرمیاں بہت سی ملکی اور بین الاقوامی جماعتوں کے ساتھ مل کر جاری رکھیں، کیونکہ بہت سی مذہبی جماعتیں جنگ سے پیدا شدہ حالات کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہوگئی تھیں۔ آگے کی تفصیلات سے آپ کو علم ہوجائے گا کہ مسلمانوں کی زندگی کی روش کمیونسٹ کنٹرول ہونے سے پیشتر کیا تھی۔

کچھ مسلمان خاندان اپنے بچوں کو حکومت کے اسکولوں میں نہ بھیجتے تھے کہ کہیں ان کے بچے اسلام سے بیگانہ نہ ہوجائیں۔ وہ اس پر مطمئن تھے کہ اُن کو مسجدوں میں درس دلوائیں اور نماز کا پابند بنائیں۔ لڑکے اور لڑکیاں صبح اور شام کو درس میں شریک ہوتے تھے، قرآن پڑھنا سیکھتے تھے اور دین کی وہ باتیں سیکھتے جس سے زندگی شریعت کے مطابق گذار سکیں۔

اس لیے وہ خود ایسے علاقوں کو چھوڑ کر چلے گئے، جو نام نہاد طور پر ترقی یافتہ شمار ہونے لگے تھے۔ اُن کے والدین نے بھی ایسے علاقوں میں رہنے پر اسلام کو فوقیت دی اور ترقی پانے کے بجائے محض مسلمان رہنا ہی پسند کیا۔ جو لوگ اپنے والدین سے الگ ہو کر دوسرے نوجوان تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح رہنے لگے، جیسا کہ اُن کے فرانسیسی آقاؤں نے انہیں تربیت دی تھی۔ وہ اپنے قابلِ قدر اخلاق سے محروم ہو گئے اور اُن میں احساسِ ذمہ داری ختم ہو گیا۔ اُن کے استاد اُن کو یہی سبق دیتے تھے کہ اسلام موجودہ حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس لیے ان کے شاگردوں نے اسلام سے رُوگردانی کی اور اپنے فرانسیسی آقاؤں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔

جدید معاشرہ نے، خواہ براہ راست یا غیر شعوری طور پر، مسلمانوں کی معاشرتی و معاشی زندگی پر ایک گہرا اثر ڈالا۔ ماڈرن تعلیم کی کمی کے سبب، وہ موجودہ معاشرتی بہبود میں حصہ نہ لے سکے اور چینیوں سے پیچھے رہ گئے، بلکہ ان قوموں سے بھی جنہیں استعماری طاقتیں اپنے مفاد کی خاطر تجارت اور معمولی صنعت و حرفت میں استعمال کرتی تھیں، مسلمان مچھلی کا شکار کھیلتے اور چاول پیدا کرتے، معمولی دست کاری کرتے۔ اور عام تجارت میں مصروف رہتے تھے۔

مسلمان سیاست میں بھی کچھ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ سہانوک کے دَور میں (جو ۹ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کے انقلاب میں تخت سے محروم کر دیا گیا) صرف ایک مسلمان مشاورتی کونسل کا درباری تھا۔ ایک اور مسلمان بطور ایک معاون کے وزارتِ مذہبی اُمور برائے بدھ مت میں کام کرتا تھا۔ انقلاب کے بعد مسلمانوں کی تعداد کچھ بڑھ گئی۔ اُمورِ خارجہ کے پہلو سے کمبوڈیا کی واشنگٹن کی سفارت میں ایک مختصر ڈ سکرٹری مسلمان تھا اور اسی طرح کمبوڈیا کا مستقل نمائندہ جینوا میں بھی مسلمان ہی تھا۔ تین اور مسلمان وزارتِ اُمورِ خارجہ فنوم پین (PHNOM PENH) میں ملازم رکھے گئے۔ مجلس قانون ساز میں سینیٹ (SANATE) کا ایک مسلمان ممبر تھا، چار مشاورتی کونسل میں اور ایک بحیثیت انڈر سکرٹری آف اسٹیٹ (UNDER SECRETARY OF STATE) کام کرتا تھا۔

کمبوڈین حکمرانوں کے ساتھ مسلمان بھی کمبوڈیا کے تحفظ میں برابر کے شریک تھے، لیکن وہ یہ

نہ چاہتے تھے کہ ویت نامی کمیونسٹ کمبوچیا کی زمین کو جنوبی ویت نام کے خلاف جنگ کرنے میں استعمال کریں۔ ۱۹۷۰ء کے فوجی انقلاب تک کمیونسٹوں کو اس بات کی اجازت تھی۔ نئے لیڈر نول (NOL) نے اس کی سختی سے مخالفت کی اور ویت نامیوں کو اس سے روک دیا۔ مسلمانوں نے ایک سکاؤٹ فوج تیار کی جو کمبوچیا کی افواج کے شانہ بشانہ کمیونسٹوں سے اپریل ۱۹۷۵ء تک لڑتی رہی۔ اس کے بعد وہ کمبوچیا سے واپس لوٹ آئے اور تحریکِ آزادی میں شامل ہو گئے جو ظلم و تشدد کے مارے ہوئے لوگوں نے قائم کی تھی۔ انگریزی میں اسے فلرو (FULRO) کہتے ہیں جو اب بھی کچھ ہند چینی علاقوں میں قائم ہے۔

کمیونسٹوں کی پُرفریب چال

کمبوچیا کے تقریباً تمام مسلمان کمیونزم کی بابت سن چکے تھے یا اخباروں، رسائل اور دوسرے ذرائع سے جان گئے تھے۔ ان کی معلومات یہ تھیں کہ کمیونسٹ اللہ کے وجود کو نہیں مانتے۔ اور یہ کہ وہ امیر اور غریب کو برابری کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ متضاد معلومات ان کو تذبذب میں ڈالتی ہیں۔ جب پہلی دفعہ اُن کے گاؤں میں کمیونسٹ آئے تو ان کے سامنے کچھ اور نقشہ نمایاں ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ کمیونسٹ اسلام اور مسلمانوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اُن کو خود نماز کے لیے بلاتے ہیں۔ خاص کر نماز مغرب اور عشاء کے وقت انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمِ قرآن کے لیے مدرسے قائم کرنے میں مدد کی اور بچوں کو ترغیب دی کہ وہ ان میں داخلہ لیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی ہر ضرورت کو پورا کیا اور اُن کو ہر اس چیز کا فیاضانہ معاوضہ دیا جو انہوں نے لی۔ ایک مرتبہ کسی کمیونسٹ نے ایک درخت سے کالی مرچ مالک کی غیر موجودگی میں توڑنے پر اس درخت کی شاخ میں ایک ریال باندھ دیا۔ حالانکہ اس کو ایک ملم دینا چاہیے تھا۔ (یعنی زیادہ عوضانہ وہاں چھوڑ دیا) اس قسم کی بہت سی حیران کن مثالیں ملتی ہیں۔ رفتہ رفتہ انہوں نے مسلمانوں پہ ایک روحانی اثر پیدا کیا۔ اور ان کے دلوں کو موہ لیا۔ مسلمانوں نے کمیونسٹوں کو انصاف اور محبت کا ایک مثالی نمونہ پایا، اور رفتہ رفتہ اُن کی پشت پناہی کرنے لگے اور اپنی املاک وغیرہ سے ان کی مدد کرنے لگے۔ اس طرح کمیونسٹ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے منظم طریقہ پہ معاشی، فوجی، سیاسی اور دیگر طریقوں سے مسلمانوں اور بدھوں کے گاؤں میں اپنی دھاک جما لی۔

اِن حالات میں ہند چینی کے مسلمانوں کو اس کا قطعی احساس نہ ہوا کہ کمیونسٹ کیا ہیں۔ جب تک کہ اُن کا کھمر روج (KHMER RONGE) کے جال میں پھنس کر قتل عام نہ ہوا۔ اس معاملے میں وہ اپنے نئے آقاؤں کے احکام کی بجا آوری اُن کی سختی کی وجہ سے نہ کر سکے اُن کو اجتماعی موت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نئے دَور میں ان کو جنگلات کو کاٹ کر کھیتیوں میں بدلنا تھا۔ اور ان میں نہریں کھودنا تھیں۔ اور یہ سارا کام کوڑوں اور سنگینوں کے سائے میں موت اور ذلّت کے تحت کرنا تھا۔ گائے کا گوشت سب کو کھانا پڑتا تھا۔ ان سے ان کا مذہب اور معاشرتی فرائض چھین لیے گئے اور اُن کو نئے احکامات کا پابند بنا دیا گیا۔ مخالفت بڑھتی گئی اور کھمر روج جیسے جیسے قتلِ عام کرتے گئے۔ بہت سے مسلمان دیہات میں خاص طور پر بغاوت پھیلتی گئی۔ یہ ایک کمیونسٹ دہشت پسند تنظیم تھی۔ اور اس نے گاؤں کے مکھیوں، مسجد کے اماموں اور مذہبی پیشواؤں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اپنے مذہب، عقیدہ اور جانوں کے تحفّظ کی خاطر جہاد کا اعلان کر دیا، حالانکہ ان کو بہت مایوسی تھی کہ وہ مسلح کمیونسٹوں کو کس طرح پسپا کر سکیں گے۔

کمیونسٹوں کی بہیمیت

کمپونگ (KAMPONG) کے مسلمانوں نے اپنے حقوق حاصل کرنے میں سبقت کی اور اپنے مذہبی فرائض آزادی سے سرانجام دینے لگے۔ دوسرے علاقوں میں مسلمان مئی ۱۹۷۲ء تک کمیونسٹوں کے زیرِ اثر رہے۔ اس عرصے میں کمیونسٹوں کو یقین ہو گیا کہ وہ مسلمانوں کو اسلام سے ہٹانے کی کوشش میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اس لیے انہوں نے قتلِ عام اور انسان کُشی کی پالیسی پر عمل شروع کر دیا۔ انہوں نے مذہبی کتابیں جلا دیں۔ ہر قسم کی عبادت پر پابندی عاید کر دی، مسجدوں کو زراعت کی مشینوں، بیج اور کھاد کے گوداموں میں بدل دیا۔ انہوں نے مسجدوں میں سؤر بھی پالنے شروع کر دیئے اور اگر کوئی سؤر مر جاتا تو امام کو اُس کی رکھوالی نہ کرنے کی سزا میں موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔ انہوں نے بہت سے اماموں، دیہات کے مکھیوں اور پروفیسروں کو قید کر دیا۔ اور ان کو انکالو (ANCKA LOEK) کمیونسٹ پارٹی کمانڈ کے ہیڈ کوارٹر لے گئے۔ ان لوگوں کو اس کے بعد کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔

۲۴ مئی ۱۹۷۴ء کو تقریباً دو بجے صبح کام پونگ (KAMPONG) کے مسلمانوں نے اپنے گاؤں کے پچاس سے زیادہ کمیونسٹ پہرہ داروں کو جان سے مار ڈالا۔ اگلے ہی دن سینکڑوں کھمر روج کے مسلح سپاہی اس گاؤں میں جمع ہو گئے اور تقریباً تین ہزار مسلمانوں کا قتلِ عام کر دیا، جن میں عورتیں، بچے اور معمر لوگ شامل تھے۔ صرف تین آدمی اس تباہی سے بچ سکے۔

اسٹنگ ٹرانگ (STUNG TRANG) کمپونگ چم (KAMPONG CHAM) صوبہ میں کمیونسٹوں نے جتنے بھی لوگ کسی مذہب سے تعلق رکھتے تھے اُن کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ مقتولوں میں سرکاری ملازم، مسجدوں کے امام اور دینی مدرسوں کے اساتذہ سبھی شامل تھے۔ باقی ماندہ کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ کسی مذہبی معاملے میں حصہ نہ لیں۔ مسجدیں مسمار کر دی گئیں۔ مسلمانوں کو سؤر کا گوشت کھانے پر مجبور کیا گیا۔ اور اُن سے وہ کام کروائے گئے جو مذہب اسلام میں ناجائز اور حرام تھے۔[1]

مزید سانحے امام عبدالرحمٰن (۴۷) ہیں جو مسلمانوں کی ایک معزز شخصیت تھے، ایک محاذ ظالم قوتوں سے لڑنے کے لیے منظم کر لیا۔ لیکن کمیونسٹوں نے انہیں ۱۲ مارچ ۱۹۷۴ء کو مع پھوم ٹری (PHUM TREA) کے گاؤں والوں کو قتل کر دیا۔ صرف چند لوگ وہاں سے فرار ہو کر میکنگ دریا کے راستے اپنے بچوں کو کندھوں پر بٹھا کر تیرتے ہوئے اس علاقے میں چلے گئے، جو حکومت کے کنٹرول میں تھا۔

۲۶ نومبر ۱۹۷۴ء عیسوی کو ساڑھے تین ہزار مسلمانوں کا تابنگ کھمام (TABUNG KHUMAM) میں قتلِ عام کر دیا گیا۔ کیونکہ کام پونگ چم کے صوبے کے مسلمانوں نے اس سے پہلے کھمر روج گارڈز کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ اس قتلِ عام سے صرف پانچ آدمی بچ سکے۔

اس سلسلے میں ۳۰ نومبر ۱۹۷۴ء کو کوہ تھام (KOH THOM) میں بہت سے مظاہرے اور بغاوتیں ہوئیں۔ شہید ہونے والوں میں امام ادریس سلیمان (۵۲) بھی تھے۔ کچھ مدت کے بعد

[1] کھمر روج: ایک کمیونسٹ فوجی تنظیم تھی جس نے کمبوچیا کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔

مسلمان مرد اور عورتوں نے کام پونگ مقام میں اپنے تحفظ کی خاطر کمیونسٹوں پر حملے شروع کر دیئے یہ واقعہ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء میں ہوا۔ مگر ان کو سختی سے کچل دیا گیا۔

۱۹۷۱ء سے کمیونسٹوں نے کمبوڈیا کے مسلمانوں پر ہر قسم کے مظالم کیے اور وہ آج تک یہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک عبرتناک بات سامنے آگئی۔ کمبوڈیا کے سنٹرل اسلامک ایسوسی ایشن کے نائب صدر نے مارچ ۱۹۷۶ء میں جدہ کے مقام پر ایک مسلمان ملک کے سفارت خانے کے ایک افسر سے گفتگو کی۔ ایسوسی ایشن کے نائب صدر نے اس افسر کو کاغذات پیش کیے جن سے کمبوڈیا میں کمیونسٹوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی زبوں حالی کا پتہ چلتا تھا۔ اس کو یہ بھی بتا یا گیا کہ مسلمان اپنے مذہبی فرائض ادا نہیں کر سکتے، عبادات اور معاشرتی اسلامی فرائض سے بھی محروم ہیں، لڑکیوں سے جنگلات میں زبردستی کمیونسٹ افواج کام لیتی ہیں، جب تک کہ وہ حاملہ نہ ہو جائیں۔ جب ایسا ہو تو ان کو ان کے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کمیونسٹوں نے اسلام کو مٹانے میں کوئی کسر کمبوڈیا میں نہیں رکھی۔ اس مسلمان سفارت خانے کے افسر نے اپنے کمیونسٹ دوستوں کی سفاکیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کہا کہ موجودہ زمانے میں یہ بات زندگی کے تقاضوں میں سے ہے کہ انسان انقلابی قوتوں کا سامنا کرے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہند چینی میں کمیونسٹ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بعض مسلمان حکومتوں سے ساز باز رکھتے ہیں اور حمایت حاصل کرتے ہوں۔ جب بھی کمبوڈیا میں کمیونسٹوں نے قتل عام شروع کیا، مشرقِ وسطیٰ کے بعض خاص ممالک کے اخبار اور ریڈیو اس بات کو مشتہر کرتے ہیں کہ کمبوڈیا کے کمیونسٹ اللہ کی مدد سے ہزاروں تخریب کاروں کو مارنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ کمیونسٹ ملک کی ترقی اور انقلاب کی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔

(جاری ہے)

رسائل و مسائل

الوہیت و عبدیت
چند متفرق سوالات

از مولانا عبد المالک صاحب جامعہ منصورہ

سوال:- گذارش ہے کہ میں آپ کی توجہ ایم۔اے کے لیے لکھی گئی کتاب بعنوان "مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ" مؤلفہ: غلام رسول ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی گورنمنٹ کالج لاہور شائع کردہ علمی کتب خانہ اردو بازار لاہور" کی ایک عبارت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

مؤلف کتاب مذکورہ ص ۴۳۴ پر خصائص نبوت محمدیہ کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے آپ کی ایک صفت " الوہیت کا مظہر اتم" بیان کرتا ہے:-

" الوہیت کا مظہر اتم ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مظہر اتم الوہیت ہیں۔ ان کا کلام خدا کا کلام، ان کا ظہور خدا کا ظہور، ان کا آنا خدا کا آنا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا - بنی اسرائیل - ۱۷-۸۱) کہ حق آیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل نے بھاگنا تھا- حق سے مراد اللہ تعالی، قرآن کریم اور رسول کریم ہیں۔ پھر فرمایا- مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى (النجم) اس آیت کریمہ میں آپ کے کلام کو وحی سے تعبیر کیا ہے۔ ایک اور آیت میں ہے- إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللهَ

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح)

اِس جگہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو مجازی طور پر اپنی ذات قرار دے دیا ہے۔ اِس طرح ایک اور آیت ہے۔ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى - (الانفال)"

میں نے پوری دیانت داری سے مکمل پیراگراف نقل کر دیا ہے۔ آپ کی مذکورہ خیالات کے بارے میں کیا رائے ہے؟ نیز آیاتِ مذکورہ کی صحیح تاویل کیا ہے؟

سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ مؤلف مذکور کتاب ہذا کے ص ۴۸۳ تا ۴۸۹ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت یا مظہر الوہیت کی پُرزور تردید کرتا ہے۔ آپ کو بشر ثابت کرتا ہے حالانکہ یہی دلائل آنحضرت پر بھی منطبق ہوتے ہیں۔

کتاب مذکورہ کے صفحہ ۱۸۲ پر "فلسفہ ویدانیت کے اثرات" کے تحت مؤلف رقمطراز ہے۔

"اِس فلسفہ نے صرف ہندوؤں کے ذہنوں اور [illegible] کو متاثر نہیں کیا بلکہ یہ فلسفہ مسلمانوں کے صوفی طبقہ پر اثرانداز ہوا ہے۔ وہ طبقہ وجودی صوفیا کہلاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابوالحسین حلاج ہندوستان آئے جہاں جوگیوں کی صحبت میں رہے اور اس فلسفہ کے اثرات لے کر یہاں سے گئے۔ اسی فلسفہ کے سرخیل شیخ محی الدین ابن عربی فصوص الحکم کے کلمہ اسماعیلیہ میں فرماتے ہیں۔

فلا تنظر الی الحق - وتعریه عن الخلق - ولا تنظر الی الحق - وتكسوه سوی الخلق - ونزهه وشبهه - وکن فی مقعد الصدق - وکن فی الجمع ان شئت - وان شئت ففی الفرق - ولا یلقی علیك الوحی - وفی غیره لا تلق -

ہمارے وجودی صوفیا نے صفاتِ الٰہیہ سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان خواہ روحانیت کے کتنے بلند مقام پر پہنچ جائے وہ عبدیت کی

آلائش سے پاک نہیں ہوسکتا۔"

پیراگراف اوّل اور دوم میں ایک وسیع تناقض نظر آتا ہے۔ مصنف کے دونوں خیالات میں کس طرح تطبیق ہوسکتی ہے؟

ایم۔اے کے اکثر طالب علم یہ کتاب پڑھتے ہیں اور یہ کتاب نہ صرف بہت سی اُلجھنیں پیدا کرتی ہے، بلکہ گمراہ کن نظریات کی اشاعت بھی کرتی ہے۔

آپ سے درخواست ہے کہ نہ صرف اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں بلکہ اگر ممکن ہو تو اس مصنف سے رابطہ قائم کرکے ان کی توجہ اِن تضادات کی طرف مبذول کرائیں اور آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ یہ بھی نہی عن المنکر کے ضمن میں آتا ہے اور اجر و ثواب کا موجب ہے۔

جواب:- آپ نے غلام رسول ایم-اے کی کتاب "مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ" سے جو اقتباسات نقل کرکے بھیجے ہیں، انہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا ذہن صاف نہیں ہے۔ اللہ کے رسول کے لیے "الوہیت کا مظہر اتم" کا عنوان قائم کرکے جو تشریح کی گئی ہے یہ اسی طرح کا انداز ہے جو عیسائی عیسٰی علیہ السلام کے لیے اختیار کرتے ہیں یا پھر مرزا غلام احمد قادیانی نے عیسائی لٹریچر کا مطالعہ کرنے کے بعد بزعم خود نبوت کے منصب پر فائز ہونے کی خاطر اپنایا ہے۔ "قل جاء الحق وزھق الباطل" "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی" "ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ" وغیرہ آیات کی تشریح میں یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو مجازی طور پر اپنی ذات قرار دیا ہے، قرآن پاک کی تحریف ہے اور اس کا مقصد غالباً یہی ہے کہ طلبہ کو غیر محسوس طریقے پر اس بات کا قائل کر لیا جائے کہ جس طرح رسول مجازی طور پر خدا ہوسکتا ہے اسی طرح کوئی اور شخص مجازی، ظلی اور بروزی طور پر نبی بن سکتا ہے۔ ان آیات کی صحیح تفسیر مکمل طور پر آپ تفہیم القرآن اور دیگر تفاسیر سے معلوم کرسکتے ہیں۔ مختصر طور پر اس کی تشریح یہ ہے کہ قل جاء الحق میں حق سے نظامِ حق اور باطل سے نظامِ باطل مراد ہے اور وما رمیت کا معنی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقع پر کفار پر

اللہ کے حکم سے اپنی مٹھی میں مٹی لے کر پھینکی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے کفار کی آنکھوں میں پہنچا دیا تھا۔ اسی کو اس آیت میں اس انداز سے بیان کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اللہ کے اذن سے جو مٹی پھینکی تھی اُس کا پھینکنا تو آپ کا کام تھا، لیکن کفار کی آنکھوں میں پہنچانا یہ اللہ تعالیٰ کا فعل تھا، آپ کا فعل نہ تھا۔ اسی طرح جن لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اُن کی اس بیعت کو اللہ کے ہاتھ پر بیعت بایں معنی قرار دیا گیا کہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کا وسیلہ اور ذریعہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا تھا۔ اس مدعا کو اُس حدیث پاک کی روشنی میں سمجھنا چاہیے جس میں آپ نے فرمایا: فمن اطاعنی فقد اطاع اللہ۔ جس نے میری اطاعت کی اُس نے درحقیقت خدا ہی کی اطاعت کی، کیونکہ حضورؐ تو خدا ہی کے احکام و فرامین پر عمل کرنے اور کرانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

مناسب ہوگا کہ محکمہ تعلیم اور حکومت سے ایسی عبارات کو تبدیل کرانے کا پُرزور مطالبہ کیا جائے۔ نیز زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اسلامی اعتقادات و احکام کی وضاحت اور تقابلِ ادیان کے موضوعات پر سنجیدہ، مستند اور عوام کا اعتماد رکھنے والے حضرات سے کتابیں لکھوائی جائیں یا کم از کم اُن سے نظرثانی کرائی جائے۔

سوال:- (چند متفرق سوالات)

۱- اپنے رہنے کے مکان کے علاوہ ہمارے دو مکان ہیں۔ میرے والد کے پاس ان مکانات کے علاوہ نقد رقم نہیں ہے۔ ہم ۵ بھائی اور ۳ بہنیں ہیں۔ تو اس بارے میں رہنمائی فرمائیں کہ بہنوں کو ان ۲ مکانات میں سے کتنا حصہ ملے گا؟ عملی صورت بتائیں۔

۲- عام طور پر لوگ بیٹی کو جو جہیز دیتے ہیں۔ کیا یہ جہیز بیٹی کے حصے میں شمار ہوتا ہے؟ یا یہ جہیز الگ چیز ہے؟

۳- کیا موجودہ طرزِ حکومت میں بجلی چوری جائز ہے؟ حالانکہ واقعہ یہ ہے کبھی کبھی بجلی والے بہت زیادہ بل بناتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ بجلی والے صحیح

بل نہیں بنتے۔

۴ — ہمارا ایک رشتہ دار ہے جو ہسپتال میں ملازم تھا۔ وہ ہسپتال کی ادویات چوری کر کے میرے والد کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ میرے والد کا ذاتی کلینک ہے۔ یعنی میرا والد۔ اس طرح خرید کردہ ادویات اپنے مریضوں کو دیتا تھا لیکن یہ چوری کی ہوئی ادویات میرے والد کی اپنی ادویات کا تقریباً ایک چوتھائی ہوتا تھا۔ آپ بتائیں کہ کیا میرے والد کی کمائی حرام ہو چکی ہو گی؟ مجھے بہت تشویش ہے۔ اب تو ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے ایسا ہوتا تھا۔

۵ — میں دو بچوں کا باپ ہوں۔ میں اِن دو بچوں کے بعد چھ یا سات مہینے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کا خواہشمند ہوں۔ تو کیا اتنے عرصے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنا جائز ہو گا؟

۶ — اس بارے میں بتائیں کہ میری بیوی کن کن لوگوں کے گھر جا سکتی ہے؟ یعنی اسلام میں کن کن لوگوں کے ہاں جانے کی اجازت ہے؟ میرے بیوی کے رشتہ داروں اور میرے رشتہ داروں میں سے۔

۷ — کیا عورتوں کو کسی سنسان جگہ پر تفریح کے لیے لے جانا اسلام میں جائز ہے؟

۸ — ایک دفعہ قرآن کے ترجمہ کے دوران یہ بات میں نے پڑھی کہ تین باتوں میں غیبت جائز ہے۔ آپ تفصیل سے بتائیں کہ وہ تین باتیں کونسی ہیں؟ ان سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں۔ میں شدت سے منتظر رہوں گا۔

جواب:۔ آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:۔

۱ — بہن بھائیوں میں وراثت اس طرح تقسیم ہو گی کہ ایک بھائی کو دو بہنوں کے برابر حصہ ملے گا۔ آپ ۵ بھائی اور تین بہنیں ہیں تو کل جائیداد اس طرح تقسیم ہو گی کہ اس کے ۱۳ حصے بنا کر دس حصے بھائیوں کو اور ایک ایک حصہ تینوں بہنوں کو دیا جائے گا — بشرطیکہ بہن بھائیوں کے علاوہ اور کوئی وارث نہ ہو۔ مکان میں سے بھی بہنوں کو اسی

تناسب سے حصہ دیا جائے گا یا انہیں اس بات پر (بلا جبر و اکراہ) راضی کر لیا جائے کہ وہ اپنے حصہ کی قیمت لے لیں۔

۲ — جہیز کی رقم یا سامان، مالِ وراثت میں سے شمار نہ ہوگا۔ وہ الگ سے باپ کی طرف سے عطیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۳ — بجلی کی چوری کسی صورت میں بھی جائز نہیں، غلط بلوں کے خلاف اجتماعی جدوجہد کرنی چاہیے۔

۴ — آپ کے والد صاحب نے چوری کی جو ادویات خرید کر فروخت کی ہیں اس کی وجہ سے ان کی باقی دولت حرام نہیں ہوتی۔ آپ کو اس سلسلہ میں جو تشویش لاحق ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آپ دکان سے ریکارڈ کی مدد سے اس طرح کی حاصل کردہ دواؤں کا حساب کرکے اس کی قیمت ہسپتال میں جمع کرا دیں اور اگر دکان میں اس کا ریکارڈ نہ رکھا گیا ہو یا ضائع ہو چکا ہو تو اندازہ لگا کر اس کے مطابق رقم جمع کرا دیں۔

۵ — خاندانی منصوبہ بندی کا مطلب اگر بیوی سے مقاربت کے لیے جانے سے اجتناب ہے تو باہمی رضامندی سے اس کی اجازت ہے اور کسی بھی عارضی مدت کے لیے مسلم زوجین کو بوجہ مجبوری ضبطِ نفس ہی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر مانع حمل ادویہ کا استعمال مراد ہے تو اس کی اجازت صرف اس صورت میں دی جا سکتی ہے جبکہ حمل سے عورت کی بیماری کے بڑھنے کا خطرہ ہو۔

۶ — بیوی کو جن رشتہ داروں کے ہاں جانے کی ضرورت ہو، خاوند کی اجازت اور مرضی سے جا سکتی ہے، بشرطیکہ وہاں غیر محرموں سے پردہ کا اہتمام بھی کرے اور وہاں اس بات کا خطرہ نہ ہو کہ عورت فتنے کا شکار ہو جائے گی۔

۷ — عورتوں کو تفریح کے لیے اسی صورت میں کسی جگہ جانے یا لے جانے کی اجازت ہے جب کہ وہاں کسی فتنے میں پڑنے کا خطرہ نہ ہو، یعنی محرم یا قابلِ اعتماد عورتیں ساتھ ہوں اور بے راہ قسم کے انسانوں کی زد سے محفوظ ہوں۔ نیز کوئی مقام خاص طور پر بدنام اور پُرخطر نہ ہو۔

۸ — درج ذیل صورتوں میں غیبت جائز ہے:۔

۱۔ ظالم کے شر اور فتنے سے محفوظ کرنے کی خاطر لوگوں کو اس سے آگاہ کرنا۔ ۲۔ کسی نے کسی سے معاملہ کرنا ہو اور آپ کے علم میں ہو کہ وہ شخص بدمعاملہ ہے تو اس کی پسِ پشت معاملہ کرنے والے کو اس کے متعلق آگاہ کرنا۔

مطبوعات

یعقوب المنصور باللہ مؤلف: طالب ہاشمی۔ ناشر: قومی کتب خانہ لاہور۔ صفحات: ۳۵۹ (سفید کاغذ) قیمت مجلد: ۲۵/- روپے

طالب ہاشمی کا نام علمی دنیا میں اب ایسا نہیں کہ تعارف کرانے کی ضرورت ہو۔ غالباً ایک درجن کے قریب تو تصانیف ہوں گی۔ کوئی بھی کتاب معمولی درجے کی نہیں بلکہ تمام کتابیں بلحاظ موضوع بلحاظ تحقیق اور بلحاظ انداز بیان اہمیت رکھتی ہیں۔ بہت اچھا ہوا کہ طالب صاحب نے اپنے لیے تاریخ اسلامی اور اس کے ساتھ سیرت و سوانح کا میدان اپنے لیے پسند کیا۔ علامہ شبلی نعمانی اور دارالمصنفین کے اہل قلم نے برصغیر پاک و ہند کا تعلق تاریخ اسلام اور اسلامی شخصیتوں سے استوار کیا تھا۔ اس کام کو طالب ہاشمی نے خاصا آگے بڑھایا ہے۔

اس کتاب کے عنوان سے گو مرکزی شخصیت یعقوب المنصور باللہ کی نمایاں ہوتی ہے مگر درحقیقت یہ فاطمیوں، مرابطین اور موحدین کے عروج و زوال کی داستان ہے اور ان کے علاوہ شمالی افریقہ خصوصاً المغرب میں اسلامی قوت کے ظہور کی تاریخ بھی سامنے آ گئی ہے۔

طالب ہاشمی صاحب محض لکھنے والے نہیں اور نہ ہی وہ غیر جانب داری کے مصنوعی مقام پر بیٹھ کر خالص بیاضیاتی اور منطقی انداز میں تاریخ لکھا کرتے ہیں۔ وہ صاحب ایمان بھی ہیں اور صاحب درد بھی۔ ساتھ ہی وہ صاحب مطالعہ و تحقیق بھی ہیں۔ جو کچھ لکھا ہے، وہ بربنائے تحقیق لکھا ہے۔ اور ایسے لکھا ہے کہ پڑھنے والے میں ایک احساس تازہ کروٹ لیتا ہے۔ زبان کے معاملے میں بھی وہ بہت محتاط ہیں اور لغت اور گرامر اور محاورے پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

اُن کی دوسری کتابوں کی طرح ہم اس کتاب کے بارے میں بھی سفارش کرتے ہیں کہ اہل ذوق اسے خریدیں، لائبریریوں میں اسے رکھا جائے اور اس کے افادہ کو عام کیا جائے تاکہ اپنی تاریخ کے آئینے کی مدد سے ہم یہ جان سکیں کہ ہمارے اصل تہذیبی و اخلاقی خد و خال کیا تھے۔ اور کن حالات میں وہ کس حد تک مسخ ہوئے۔ اور کب کس نے ہماری مسخ شدہ صورت کو درست کرنے کی کوشش کی۔

یہ امر قابل تحسین ہے کہ کتاب بہت کم قیمت میں پیش کی گئی ہے۔

اسلام اور سائنس مؤلف: جناب منشی عبدالرحمٰن خاں۔ ناشر: ادارۂ اشاعتِ علومِ اسلامیہ، چہلیک، ملتان۔ قیمت مجلد سفید کاغذ، ۲۶۲ صفحات ۲۱/- روپے

مذہبی امور میں منشی عبدالرحمٰن خاں کا نقطۂ نظر کچھ بھی کیوں نہ ہو اور اس کی زد کہیں بھی پڑتی ہو۔ مگر یہ بہرحال درست ہے کہ انہیں اسلام کے فروغ اور معاشرے کی اصلاح سے گہری دلچسپی ہے۔ اسی جذبے سے انہوں نے دورِ رواں کے ایک اہم موضوع "اسلام اور سائنس" پر مختلف اصحاب کے مقالات کا مجموعہ تیار کیا ہے۔

۱۴ حضرات کے مقالات و مضامین مختلف عنوانات سے اس مجموعے میں شامل ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ یہ سارا جمع شدہ مواد افادیت رکھتا ہے، مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ اسلام اور سائنس کے موضوع پر ابتدا میں جو سیدھی سادی بحثیں ہوئی ہیں، اُن سے معاملہ اب آگے جا چکا ہے۔ آج کے لوگوں کے مطالعہ کا افق وسیع تر اور سوالات زیادہ پیچیدہ ہیں، اور اب سائنس کے جدید تر انکشافات کو سامنے رکھ کر بحثیں اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ اُمید ہے کہ وہ کام کو آگے بڑھائیں گے۔

اس قسم کے علمی کاموں میں کوئی گروہی نقطۂ نظر اختیار کرنے سے کام کی افادیت محدود ہو جاتی ہے۔ کچھ اور رسالے اور کچھ اور لوگ بھی تھے، جن کے کیے ہوئے کام اس موضوع پر بہت مؤثر ہو سکتے تھے۔ علمِ سائنس کی پیدا کردہ الحادی فکر کے خلاف لڑنا ہو تو محاذ زیادہ بڑا اور مضبوط ہونا چاہیے۔ لیکن اگر وہ اپنے کھینچے ہوئے دائرے سے باہر کسی سے ہاتھ نہ ملا سکتے ہوں تو

اس طرح کے وسیع الافق کام وہ دوسروں کے لیے چھوڑ دیں۔

روئیدادِ سفرِ حرم | از مولانا عبدالحلیم قاسمی۔ ناشر: جامعہ حنفیہ قاسمیہ، گلبرگ ۲ - لاہور

قیمت: -/۵ روپے

فاضل مؤلف اُن خوش نصیبوں میں سے ہیں جو حج و زیارتِ حرمین سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اس چھوٹی سی کتاب میں کچھ حصہ واقعاتی سفرنامے کا ہے جس کے پڑھنے سے آئندہ کے عازمینِ حج کو فائدہ ہوگا۔ علاوہ ازیں مسائل و مناسک اور مختلف مواقع کی دعائیں مع ترجمہ شاملِ تالیف ہیں۔ مزید یہ کہ ۵۰ احادیث مبارکہ مع ترجمہ پیش کی گئی ہیں۔ آخر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی و طہری رشتوں کا بیان ہے۔ یہ سارے مندرجات بہت مفید ہیں۔

افضل کون، سارہؓ یا ہاجرہؓ | مؤلف: ڈاکٹر احسان الحق رانا۔ ادارۂ تحقیق مذاہب، گلبرگ۔ لاہور۔ ناشر: اسلامی مشن سنت نگر۔ لاہور۔ قیمت: درج نہیں۔

ڈاکٹر احسان الحق رانا صاحب کے نام اور کام کا تعارف ان اوراق میں کرایا جا چکا ہے وہ عیسائی مشنریوں کے تبلیغی محاذ کے مقابلے پر اپنا مورچہ جمائے ہوئے ہیں۔ عیسائی پروپیگنڈا یہ ہے کہ جناب سارہؓ حضرت ابراہیمؑ کی اہلیہ تھیں اور جناب ہاجرہؓ ایک لونڈی۔ پھر مزید دلائل سے وہ ثابت کرتے ہیں کہ جناب سارہ افضل تھیں، لہٰذا اُن کی اولاد (آلِ اسحٰق) بھی افضل ہے۔

مشنریوں کے گھڑے ہوئے اس طومار کے خلاف ڈاکٹر رانا نے بائیبل کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ جناب ہاجرہ کو شرف و فضیلت حاصل تھی۔

مکتوبِ لطیف فی حجیتِ حدیث | مؤلف چوہدری محمد سرفراز خاں۔ کالرہ کلاں ضلع گجرات

قیمت درج نہیں۔

چوہدری سرفراز خاں کی تحریروں پر مطبوعات کے صفحات میں پہلے بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ دردمند

مسلمان ہیں، نکتۂ توحید کے لذت آشنا اور قرآن و حدیث کے چشمۂ علم سے فیض یاب۔
پیشِ نظر پمفلٹ کی بنیاد اس خط پر ہے جو طلوع اسلام کے مضمون "اسباب زوال امت"
کے متعلق چوہدری صاحب نے چوہدری صاحب (غلام احمد پرویز) کو لکھا۔ اس خط کی بحث
سے "قرآن بلا حدیث" (یا خدا بغیرِ رسول) کے مسلک پر سخت زد پڑتی تھی۔ پرویز صاحب
نے بے نیازی سے توڑ کرنا چاہا، ماہر صاحب نے خط فاران میں چھاپ دیا۔ چوہدری سرفراز خان
صاحب پیچھے پڑے ہے۔ تھوڑی سی جو خط و کتابت ہوئی وہ اس پمفلٹ میں ہے۔ اصل
چیز وہ بحث ہے جس میں مؤلف نے دلائل و نظائر سے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ کی تشریحات و
توضیحات (قولی و عملی) سے بے نیاز ہو کر کوئی شخص قرآن فہمی کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔
اس مبحث میں اوروں نے بھی حصّہ لیا ہے اور اہم کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر چوہدری سرفراز خان
کا پمفلٹ (۸۶ صفحات) بھی بہت مفید و مؤثر ہے۔

قرآن کے تراجم کا تقابلی مطالعہ از میاں بشیر احمد صاحب۔ ناشر: مجلس خبر و نظر ۴۰۴،
محمود آباد گیٹ کراچی ۴۴۔ سفید کاغذ، آرٹ کارڈ پر ٹائیٹل۔ قیمت: ۱۲/- روپے

مؤلف نے اچھے مقصد سے یہ کتاب لکھی ہے، مگر نام کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ انہوں نے
دو مادّوں "ع ب د" اور "د ع ا" کے استعمالات کی چند مثالیں دے کر سمجھانا چاہا ہے کہ عبادت کا
مفہوم پوجنا نہیں، بلکہ بندگی اور حکم ماننا یا سرِ تسلیم خم کرنا ہے، اور دُعا (مشتقات: یدعون، تدعون،
لا تدع وغیرہ) کے معنی پکارنا (خصوصاً مدد کے لیے) ہے، نہ کہ عبادت یا پوجا کرنا۔

قرآن کے جن ترجموں سے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ یہ کون سے
ترجمے ہیں اور کس کے۔

بہتر یہ ہوتا کہ اردو کے چند بہترین مستند ترجموں کو یکجا رکھ کر تقابلی انداز سے دکھایا
جاتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کام ادھورا سا ہے۔

مؤلف کا ایک مقصد یہ ہے کہ اربابِ تعلیم متنبہ ہو کر مدارس میں بچوں کو ایسے غلط تراجم
نہ پڑھائیں جو ان میں شرک کے بیج بو دیں۔

یزید کی شخصیت از مولانا عبدالرشید نعمانی ۔ ناشر: مکتبہ اہل سنت والجماعۃ ۔ ۸۸۴ قائم آباد کراچی ۱۹ ۔ قیمت: ۱۵/- روپے

مسلمانوں میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے کہ بڑے سے بڑے بیّن واقعہ، تاریخی اور نہایت درجہ معلوم و معروف شخصیتوں کے متضاد عکس پیش کر کے پھر ہر عکس کے گرد ایک دھڑا بناتے ہیں، اور پھر خوب لڑتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جب اغیار کے ہاتھوں مار پڑتی ہے تو اتحاد و اتحاد کا آوازہ بھی بلند کرتے رہتے ہیں۔ فیا للعجب! تاریخ سے کشتی لڑنے والوں کے فنّی کمالات آدمی کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

ایسا ہی معاملہ واقعۂ کربلا اور امام حسینؓ اور یزید کے بارے میں کیا گیا ہے۔ پچھلے دنوں ہم ایک پمفلٹ کا تعارف کرا چکے ہیں جس کا ملخص یہ تھا کہ یزید کے حکم سے اس کی فوجیں تو امام حسینؓ کے تحفظ کے لیے گئی تھیں، یہ تو کوفی تھے جنھوں نے امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کو نشانہ ظلم بنایا۔ دوسری طرف "عباسی اسکول" ہے، جس نے یزید کو تو "علیہ السلام" اور "رحمۃ اللہ علیہ" کے القابوں کی مسندوں پہ بٹھایا اور (نعوذ باللہ) امام حسین اور ان کے ساتھیوں کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ بلکہ مجموعی طور پر اہل بیت کے وقار کو کم کر دیا۔ حالانکہ امام حسینؓ اور یزید تاریخ میں دو متضاد علامتیں بن چکے ہیں۔ اور ایک کا تصور کرتے ہی احقاق حق اور اس کے ساتھ قربانی و مظلومیت کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اور دوسرے کا ذکر آتے ہی جبری بادشاہت اور ظلم و فسق کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

"عباسی اسکول" اور "اصحابِ مجلسِ عثمان" (کراچی) نے یزید کو مغالطہ انگیزیاں کر کے جس طرح ہار سنگھار کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کی تردید پیش نظر کتاب میں بخوبی کی گئی ہے۔ تاریخ کے اوراق پہ کج بیانی کی جو گرد ڈال دی گئی تھی، اسے نعمانی صاحب نے علمی تحقیق کے برش سے پوری طرح صاف کر دیا ہے۔

یزید کے فضائل میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف امام حسینؓ کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں اُن کا اس کتاب میں رد ہے۔ خاص طور پہ یزید کی شخصیت سے فضائل و مناقب کے وہ سنہری اور ریشمی پردے نوچ لیے گئے ہیں جو نادلیات کے زور سے اختراع کیے گئے

ہیں۔ پردے ہٹنے کے بعد بدنما چہرے کے ساتھ ایک سڑتی ہوئی لاش سامنے آتی ہے۔

نعمانی صاحب کی کتاب اگر محض مناظرانہ نوعیت کی ہوتی تو کوئی اہمیت نہ تھی۔ انھوں نے تحقیق کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اور مستند بزرگوں کے ارشادات اور قابلِ اعتماد تاریخی حوالوں سے بحث کو بھر دیا ہے۔

ماہ محرم کی مناسبت سے اس کتاب کی وقعت اور بھی زیادہ ہے۔ ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔

(بقیہ زکوٰۃ ـ نظریہ اور عمل)

۱ مثقال = ۲۰ قیراط = ۴۰۰۰ ملی گرام = ۴ گرام

۱ درہم = ۱۴ قیراط = ۲۸۰۰ ملی گرام = ۲۰۸ (2.8) گرام

۱ صاع گیہوں = ۷۲۰ مثقال = ۱۴۴۰۰ قیراط = ۲۸۸۰۰۰۰ ملی گرام

= ۲۸۸۰ گرام = ۲۰۸۸ (2.88) کلو گرام

اس حساب سے عفو کی حد یہ قرار پاتی ہے:۔

سونے کی حد = ۲۰ مثقال = ۸۰ گرام

چاندی کی حد = ۲۰۰ درہم = ۵۶۰ گرام (تقریباً نصف کلو گرام عفو کی حد لی جا سکتی ہے) سونے اور چاندی کے لیے زکوٰۃ کی سالانہ شرح ۲½ فی صد (ط = ۰۲۵ء)۔ سال سے مراد قمری سال ہے۔ علما کے نزدیک مال تجارت کا حساب سال پورا ہونے پر سونے اور چاندی کی مروجہ قیمت لگانا مناسب ہے۔ جس نقدی سے عفو کی حد پوری ہو جائے گی اور قیمت زیادہ ہوتی ہو اسی سے حساب کرنا چاہیے۔

(جاری ہے)

احتیاط:۔ ترجمان القرآن میں ضرورت استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔ (ادارہ)

(بقیہ اشارات) کر گئے ہیں۔

نمود و نمائش کے اس طوفان کو زور پر رکھنے کے لیے وافر پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور وافر پیسہ متوسط درجے کی ملازمت یا کاروبار سے نہیں مل سکتا۔ اس کے لیے بیگم صاحبہ ایک تو خود اپنی ملازمت کی راہ نکالتی ہیں۔ اور چھوٹے بچوں کو "کے جی" کے سپرد کر دیتی ہیں۔ پھر بھی کام نہیں چلتا تو وہ شوہروں پر دباؤ ڈالتی ہیں کہ دیکھو فلاں تو ایسی ایسی کوٹھی میں رہتا ہے اور فلاں کی کار بھی ہے اور فلاں کی بیوی یوں پیش پیش ہے۔ ایک تم ہو کہ چھوٹی سی تنخواہ کے کولہو کے بیل بنے ہوئے ہو۔ اور نہ رہنے کو ڈھنگ کا کوئی مکان، نہ مناسب فرنیچر اور کراکری، تمہاری بیگم کا یہ حال کہ کسی اچھی محفل میں جائے تو جمعدارنی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح خاوندوں کو نالائق اور بیوقوف ہونے کا احساس دلا دلا کر یہ انہیں تیار کرتی ہیں کہ وہ عوام کا خون نچوڑیں اور اس کی سرخی اُن کی آبرو بنے۔ بعض شعلہ جوالہ قسم کی بیگمات تو تیز تیز آگے بڑھنے کے جوش میں اس بری طرح پھسلتی ہیں کہ ساری عمر روح کے زخم چاٹتی رہتی ہیں۔ بصورتِ دیگر تمام احساساتِ شرافت و حیا کو اپنے آپ سے اس طرح الگ کر دیتی ہیں جیسے آنچل سر سے اتار پھینکا جائے۔

ایسے حالات میں پولیس کے اُس سابق ملازم کا کردار کتنا منفرد، کتنا گراں بہا اور کتنا روشن نظر آتا ہے۔

خدا ہم کو، اور ہر مسلمان کو ایسا ہی کردار عطا کرے۔ ہر طرف ایسے لوگ اُٹھ کھڑے ہوں جو دوسروں سے چھینے ہوئے حقوق اُن کو ادا کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔ نیز جو لوگ اس وقت ناجائز کمائی کے لیے ظلم و خیانت سے کام لے رہے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے جوابدہی کے خوف سے اپنی اصلاح کر لیں۔

عُلماءِ دین ! — عُلماءِ طِبّ — بنئیے !!

اور

ایک باعزت ، موثر اور مفید — "ذریعہ معاش" جو

دینی خدمات کو موثر اور ان کے دائرہ کو وسیع کرنے کا ذریعہ

بھی ہے — اس سے بہرہ ور ہو جائیے !

اَلحمدُ لِلّٰہ

کہ پاکستان میں دینی مدارس کی اسناد کو طبّی تعلیم کے لیے بنیادی صلاحیت تسلیم

کر لیا گیا ہے — اور

جَامعہ طبّیہ اِسلامیہ فیصل آباد

نے یہ فیصلہ کیا کہ دینی مدارس کے فاضل اور ثانویہ یا موقوف علیہ سے فارغ ذہین طلبہ — کو ترجیحی بنیاد پر قبول کیا جائے اور ان میں سے مستحق حضرات کو فیس وغیرہ میں خصوصی رعایت کا مستحق بھی قرار دیا جائے۔ درخواستیں بلا تاخیر مع نقول اسناد اور مدرسہ کے مہتمم صاحب کی جانب سے سیرت و اخلاق کی توثیق کے ساتھ درج ذیل پتہ پہ پہنچ جانا چاہئیں۔

(پہلے درخواست پہلے داخلہ کا اُصول بھی ملحوظ رہے گا)

عبدالرحیم اشرف — ۳۷۵ - جناح کالونی فیصل آباد